U16714 17-11-09

-tle - ISHARAAT-E-IQBAL (Edition-2).

-rator - Murattibe Abdur Rehman Tariq.

-blisher - Kitab Manzil (Lahore).

Date - 1951

-ages - 215

Subjects - Iqbaliyaat - Tanqeed; Iqbal - Isharaat-o-Talmehaat.

سلسلہ مطبوعات نمبر ۳۸

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں — رومیؒ

اشاراتِ اقبالؒ

جس میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی اردو تصنیفات
میں سے جملہ اشارات و تلمیحات کو ہر جہت سے
مکمل و مفصل صورت میں حل کیا گیا ہے!

مرتبہ و مؤلفہ
عبدالرحمٰن طارق بی اے

ناشر
کتاب منزل لاہور

بار اوّل — ۱۹۴۸ء

بار دوم — ۱۹۵۱ء

قیمت —— ۳/۸

شیخ نیاز احمد پرنٹر پبلشر نے پاکستان ٹائمز پریس لاہور [illegible] بازار لاہور سے شائع کیا

حسنِ اشارہ

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایمائیست

اقبالؒ
در "پیامِ مشرق"

انتساب

میں اپنی اس علمی و ادبی خدمت کو بہ عقیدت منا
اقبالؒ کے اسم گرامی سے منسوب کرتا ہوں۔ کیونکہ
میرے عقیدہ میں یہی خوش نصیب افرادِ اُمتِ مسلمہ
میں ایک عدیم النظیر ذہنی اور عملی انقلاب کے علمبردار ہونگے!

طارق

فہرست مضامین

دیباچہ

علامہ اقبالؒ کی تصنیفات میں اکثر اشعار ایسے ہیں جن میں کسی نہ کسی آیۂ قرآنی، ارشادِ نبویؐ یا تاریخی واقعہ کی جانب اشارہ پایا جاتا ہے اور جب تک ایسے اشارات کا مکمل اور تسلی بخش حل نہ ہو۔ شعر کا مطلب و مدعا کسی صورت سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل تین اشعار ہی کو لیجئے:۔

سختیاں سہتا ہوں دِل پر غیر سے غافل ہوں مَیں
آہ! کیا اچھی کہی ظالم ہوں مَیں جاہل ہوں مَیں

کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم!
علمِ موسےٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

پہلے شعر میں کیا معلوم کہ کس نے کس "ظالم و جاہل" کہا، اور کن وجوہ کی بنا پر ایسے "خطابات" سے سرفراز کیا۔ دوسرے شعر کے متعلق کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علمِ موسیٰؑ علمِ خضرؑ کے مقابل کیوں "حیرت فروش" ہے، اور "کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم" جیسی پُر اسرار چیزیں کہاں مذکور ہیں، اور ان کی حکیمانہ تعبیر و تفسیر کیا ہے۔ اور بالآخر تیسرے شعر میں وہ کونسا عشق تھا جو آتش نمرود میں کود پڑا، اور وہ کونسی عقل تھی، جو یہ ماجرا دیکھ کر محو حیرت رہ گئی اور عشق کی جسارت کا اندازہ کرنے سے قاصر رہی۔

الغرض یہ ہر سہ اشعار حسبِ موقع و محل قرآن کریم کے تین مستقل اجزاء کا سیر حاصل مطالعہ چاہتے ہیں، آیات کے عام فہم تراجم اور تشریح مطالب کے متقاضی ہیں، اور پھر کہیں جا کر صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ نے جو کچھ فرمایا وہ معنوی حیثیت سے کس عظیم الشان پیغام کا حامل ہے کسی تفصیل سے قطع نظر اگر محض اتنا کہہ دیا جائے کہ (۱) اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں انسان کو ظالم اور جاہل قرار دے رہا ہے۔ (۲) حضرت خضرؑ نے ایک غریب ملاح کی کشتی توڑ دی تھی، نابالغ بچے کو بلا قصور ہلاک کر ڈالا تھا، اور یتیموں کی ایک شکستہ دیوار بلا اجرت تعمیر کر دی تھی۔ لہٰذا حضرت موسےٰؑ ان عجیب و غریب حرکات کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوئے (۳) اور پھر حضرت ابراہیمؑ نے آتش نمرود میں بلا خوف و خطر چھلانگ لگا کر حاضرین کو حواس باختہ کر دیا، تو آپ ہی فرمائیے کہ اس مختصر اور سادہ انداز بیان سے قارئین کی

کس حد تک تسلی و تشفی ہوئی ؟

الغرض اقبالؒ کے اشارات اختصار نہیں بلکہ تفصیل کے متقاضی ہیں اور مذہبی یا تاریخی لحاظ سے اُن کا مکمل سُراغ لگائے بغیر مفہوم اشعار کا پالینا ناممکن ہے !

تلمیح بذاتِ خود علمِ بدیع کے صنائع معنوی میں ایک مستقل صنعت ہے ، اور ائمہ فن نے اس صنعت کو جانِ بلاغت قرار دیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تھوڑے سے تھوڑے الفاظ میں بسیط سے بسیط مضمون کی جانب بایں طور اشارہ کردیا جائے کہ قاری کا ذہن فوراً اُس آیۂ شریفہ یا واقعہ کی جزئیات کا احاطہ کرلے ۔ ہاں ، احاطۂ معانی کے لیئے قاری کا اپنی مذہب کتب اور تاریخی روایات سے باخبر ہونا ضروری ہے ، ورنہ وہ "ظالم و جاہل" اور کشتیٔ مسکین و جانِ پاک" جیسے دقیق و دُور اُفتادہ اشارات سے قطعاً محظوظ نہ ہوسکے گا !

ہمارے ملک میں چونکہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کی نگاہ اقبالؒ جیسے عالم متبحر اور حکیم اشراقی کے اشارات تک رسائی نہیں رکھتی ، لہٰذا میں نے مدّت مدید کی تحقیق و جستجو کے بعد علامہ مرحوم کی تمام اُردو تصنیفات کے اشارات اِس جلد میں حل کردیئے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ بفضلِ الٰہی ایک اور جلد میں فارسی تصنیفات کے خاص خاص اِشارات و تلمیحات کو بھی عام فہم انداز میں حل کردوں گا۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ۔

اساتذۂ علمِ معانی یہ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ اجمال تفصیل کے مقابلے میں ، اور اشارہ وضاحت کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ لطیف و مؤثر ہوا کرتا ہے ، اور بسا اوقات جس مضمون کو فقط ایک دو لفظ

جس حسن و خوبی سے ادا کر جاتے ہیں، وہ دو چار صفحات سے بھی ممکن نہیں۔ اس بلاغت کا ثبوت کلام اقبالؒ کا بیشتر حصّہ ہے، جس کا ہر لفظ "گنجینۂ معنی" کا حیرت انگیز "طلسم" ہے، اور غالباً اسی بنا پر علامہ مرحوم نے خود بھی ارشاد فرمایا ہے کہ

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

یعنی:۔ "اپنے مفہوم و مدّعا کو بالکل برہنہ اور واضح الفاظ میں نہ کہنا فنِ تقریر کا انتہائی کمال ہے، کیونکہ اہلِ معرفت اور رازدانِ ذاتِ باری تعالیٰ کی گفتگو ہمیشہ رمز و ایماء پر مبنی ہوا کرتی ہے۔"

چنانچہ اقبالؒ کی بیشتر تلمیحات فنِ بلاغت کے اسی اصولِ رمز و ایماء پر بوجہ احسن پوری اُترتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اوقات صرف ایک شعر میں ہمیں دین و حکمت یا سیاسیات حاضرہ پر ایک مکمل اور مستقل کتاب تفویض فرماتا ہے!

طارقؔ

بانگِ درا

"بانگِ درا" کے اِشارات

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیمؑ
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

"بانگِ درا" میں چونکہ جلوۂ طور، ریاضِ طور اور کلیم اللہ کی جانب بکثرت اشارات موجود ہیں، لہٰذا اس نوع کے اشعار پیش کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ حدیثِ "لن ترانی" کا تاریخی اور قرآنی پس منظر آپ حضرات کے پیشِ نظر لایا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب دس سالہ ہجرت کے بعد مدین سے مصر کو واپس آتے ہوئے حضرت موسےٰؑ نے وادیِ طویٰ میں ایک درخت کے اندر اللہ تعالیٰ کی تجلیات دیکھیں اور اُس سے ہمکلام ہوئے (جس کی بنا پر انہیں "کلیم اللہ" کہا جانے لگا)، تو بعد میں دیدارِ الٰہی کا انہیں ایسا ذوق و شوق پیدا ہوا کہ جب آپ طور پر تورات لینے گئے ہیں تو اپنے خالق سے فرطِ محبت میں تقاضا کیا کہ رَبِّ اَرِنِیۤ اَنْظُرْ اِلَیْکَ۔ "اے پروردگار! مجھے ایک دفعہ اپنا دیدار کرا"۔ اِس مطالبہ پر خدائے ذوالجلال نے جواب

دیا کہ " لَنْ تَرَانِیْ " ! یعنی " تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا " ..... بایں ہمہ حضرتِ موسےٰؑ کا شوقِ دیدار اس قدر اضطراب انگیز تھا کہ نقاب کشائی کا دوبارہ تقاضا کیا۔ یہ اصرار دیکھ کر اُس محبوبِ حقیقی نے اپنے عاشقِ صادق کو شکستہ خاطر تو نہ کرنا چاہا، لیکن محض اتمامِ حجت کے لئے فرمایا کہ پہلے میں پہاڑ پر اپنی تجلّیات پھینکتا ہوں۔ اگر وہ میرے جلوۂ نور کی تاب لا سکا، اور اپنی جگہ پر برقرار رہا تو پھر تجھے بھی دیدار سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ حضرت موسےٰؑ اس شرط پر رضامند ہو گئے۔ چنانچہ طور پر تجلّیات کا گرنا تھا کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور پتھر غبار کی مانند اُڑنے لگے۔ پس تجلّیاتِ باری تعالیٰ کا بذاتِ خود متحمل ہونا تو کجا، فقط اُن کی دید سے حضرت موسےٰؑ بیہوش ہو کر گر پڑے اسی بنا پر علّامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ :-

اُڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیمؑ
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

بہرکیف میں اس نوع کے تمام اشعار ذیل میں پیش کرتا ہوں، اور جس موقع و محل اور مقصد و مدّعا کے تحت اقبالؒ نے اُنہیں ترتیب دیا ہے، اُس کی تشریح و توضیح بھی کئے جاتا ہوں۔

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے ۔ صـ۳

یہ شعر عنوان " ہمالہ " کے تحت واقع ہوا ہے۔ ہمالہ کو مخاطب کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ کوہِ طور پر کلیم اللہ کے لئے تو ایک ہی جلوہ تھا لیکن تو سرِ چشمِ بینا کے لئے ہمہ وقت تجلّیات کا پیکر بنا ہوا ہے!

میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طُور ہے
میں چمن سے دُور ہوں، تو بھی چمن سے دُور ہے		ص۲

یہ شعر عنوان "گلِ رنگین" کے تحت واقع ہوا ہے۔ شاعر پھول کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تو بھی میری طرح ریاضِ طُور کا ایک پتّا ہے، اور جس طرح مَیں اپنے چمن (مراد عالم لاہوت یا ماورائے کون و مکاں) سے دُور ہوں، اسی طرح تو بھی چمن سے دُور مارا مارا پھرتا ہے۔ حاصل یہ کہ ہر چیز کی عزّت و عظمت اُس کے اصل وطن یا مسکن پر موقوف ہے!

"ریاضِ طُور" وادیِ طوی کا وہ درخت ہے جس میں حضرت موسےٰؑ نے تجلّیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا تھا۔

دید سے تسکین پاتا ہے دلِ مہجور بھی؟
لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی؟		ص۲۶

یہ شعر "خفتگانِ خاک سے استفسار" کے تحت واقع ہوا ہے۔ شاعر اسلاف کی روحوں سے سوال کرتا ہے کہ وہاں بھی ہجر و فراق کے ستائے ہوئے دل دیدارِ حُسن سے تسکین پا سکیں گے یا یونہی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپا کریں گے؟ کہیں دوسری دُنیا کے طور پر بھی "لن ترانی" کہہ کر عشاق کے دِلوں کو شکستہ و رنجیدہ تو نہیں کریں گے؟

گویا اس بہانے سے شاعر وقتی طور پر اپنے دردِ فراق کا ازالہ کرنا چاہتا ہے اور زخم ہائے تیرِ حوادث کے لئے الفاظ کا مرہم تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ اس نظم کا آخری شعر ہے۔۔

تم بتا دو راز جو اِس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چُبھتا ہُوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حُسنِ قدیم ہے
چھوٹا سا طُور تو، یہ ذرا سا کلیم ہے — ص ۲۷

عاشقِ حُسنِ قدیم سے مراد حضرت موسےؑ ہیں۔ یہ شعر عنوان "شمع و پروانہ" کے تحت واقع ہوا ہے۔ شاعر شمع کو طُور اور پروانے کو کلیمؑ قرار دیتے ہوئے حُسن و عشق کی ماہیت پر روشنی ڈالتا ہے، اور کہتا ہے کہ شمع گویا طُور کی مانند اپنی تجلّیات بکھیر رہی ہے اور پروانہ مثلِ کلیمؑ اُس پر فدا ہو جاتا ہے۔

وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیبِ درختِ طُور مرا آشیانہ تھا — ص ۳۳

یہ شعر نظم "شمع" کے تحت مندرج ہے۔ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں آزادی اور مسّرتِ روحانی کا وہ زمانہ ہاتھ سے جا چکا ہے جبکہ میں فطرت کی پاکیزہ و منوّر اور گناہ سے بے آلائش دُنیا میں آباد تھا۔ اُس وقت طُور کے اُس درخت پر میرا آشیانہ تھا جو تجلّیاتِ الٰہی کا مرکز رہا۔ لیکن اب تو ہوا و ہوس کی دُنیا میں یہ حالت ہے کہ روح گویا خواہشات کے پنجرے میں مقید ہے، اور طولِ امل کے باعث اطمینانِ قلب بالکل مفقود ہو چکا ہے!

قصّۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل
التجائے "ارنی" سُرخیِ افسانۂ دل ص۵۴

یہ شعر عنوان "دل" کے تحت مندرج ہے۔ مصرعِ اوّل میں قصّہ دار و رسن سے مراد زیادہ تر منصورؒ کا قصّہ ہے۔ جس نے اپنی مستیِ عشق میں "انا الحق" کا نعرہ لگایا، اور سزا میں دار و رسن کو کوئی اہمیت نہ دی، بلکہ اسے بچّوں کا ایک کھیل تصوّر کیا، ہاں، مصرع دوم میں پھر حضرت موسےؑ کے مطالبۂ "ارنی" (اے خدا! مجھے اپنا جلوہ دکھا) کی جانب اشارہ ہے، جس کی تفصیل آپ پیشتر ازیں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ "ارنی" افسانۂ دل کا عنوان ہے یعنی عارف کا دل سب سے پہلے تجلّیاتِ الٰہی کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ یہی اُس کی بہترین غذا ہے!

محبّت کے شرر سے دل سراپا نُور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طُور ہوتا ہے ص۷۰

یہ شعر نظم "تصویرِ درد" کے تحت واقع ہُوا ہے۔ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ در حقیقت دردِ محبّت ہی سے دل کے تاریک گوشے منوّر ہوتے ہیں۔ اور اِسی بیج سے طُور کا مقدس و برگزیدہ درخت پھلتا پھولتا ہے!

کھینچے خود بخود جانبِ طُور موسےؑ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی؟ ص۱۰۱

یہ شعر غزل میں سے ہے۔ مقصد شاعر کا یہ ہے کہ شوقِ دیدار عاشق کو خود بخود معشوق کی جانب

کھینچ کر لے جاتا ہے، اور اس میں ایک ناقابلِ مقاومت مقناطیسی کشش پنہاں ہے!

کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر
کیا خبر ہے تجھ کو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا؟ صہ ۱۰۴

یہ شعر بھی غزل کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ طُور پر حُسن و عشق کے مابین گفتگو بھی تھی اور چند در چند تقاضے بھی تھے۔ لیکن اے دِل! تو کیا جانے کہ اُس ناز و نیاز کا فیصلہ کیونکر ہوا؟ مقصد یہ ہے کہ جو دِل حُسن و عشق کی نوک جھونک اور وارداتِ باطنی سے بے خبر ہو، وہ اُن کی کیفیات و جذبات کا خاطر خواہ اندازہ نہیں کر سکتا!

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیمؑ
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی صہ ۱۰۵

یہ شعر بھی ایک غزل میں سے ہے۔ فرماتے ہیں کہ کلیم اللہ نے دیدار کا تقاضا تو کیا، لیکن وہ اس کے متحمل نہ ہو سکے۔ اِس مثال سے ہمیں سبق یہ ملا کہ ہر شئے طلب کرنے سے پہلے انسان اپنے ظرف کو دیکھ لے کہ اس میں سمائی بھی ہو گی یا نہیں۔ بالفاظِ دیگر کائنات میں ہر چیز کی آرزو بقدرِ ہمّت و توفیق ہونی چاہیئے۔ اِسی بنا پر غالب بھی کہہ گیا ہے کہ :-

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

چھپایا حُسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں صفحہ ۱۰۷

یہ شعر بھی ایک غزل میں سے ہے۔ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ جس معشوق حقیقی نے اپنے حُسنِ جہاں افروز کو چشم کلیمؑ سے چھپایا تھا، وہی معشوق دراصل اپنی تجلّیات کو منفرد صورت میں حسینانِ عالم کے دلربا چہروں میں نمایاں کئے ہوئے ہے۔ بعینہٖ یہی عقیدہ اہلِ تصوف کا بھی ہے کہ خالق کا جمال مخلوق کے جمال میں ہر جگہ بکھرا پڑا ہے، اور حُسنِ انسانی میں بھی حسنِ ایزدی کے شاہکار موجود ہیں۔ غالب اسی تصور کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے :-

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خودبیں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی "لن ترانی" سُنا چاہتا ہوں صفحہ ۱۱۱

یہ شعر بھی غزل میں سے ہے۔ فرماتے ہیں کہ دل اگرچہ گوشت کا ذرا سا ٹکڑا ہے لیکن اس میں شوخی اور جرأت اس غضب کی ہے کہ آج بھی طور کی صدائے "لن ترانی" سُننے کا آرزومند ہے!

شوخی سی ہے سوالِ مکرّر میں اے کلیم
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے صفحہ ۱۱۲

یہ شعر بھی غزل میں سے ہے۔ فرماتے ہیں کہ تقاضا آدابِ محبت کے سراسر خلاف ہے۔ عاشق کا فرض ہے کہ تسلیم و رضا کو اپنا شعار بنائے، اور محبوب کی خوشنودی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ کامل اطاعت عشقِ صادق کی اوّلین شرط ہے۔ اسی مفہوم کو ایک اور جگہ بھی بیان فرمایا ہے:۔

صدائے لن ترانی سُن کے اے اقبال میں چُپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے ماروں میں ص ۱۴۷

خود تجلّی کو تمنّا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں نا امیدِ نورِ ایمن ہو گئیں! ص ۲۰۷

یہ شعر نظم "شمع اور شاعر" کے تحت واقع ہُوا ہے۔ شمع شاعر کو مخاطب کرتے ہوئے جہاں قوم و ملت اور بہت سی محرومیوں کا رونا روتی ہے، وہاں ایک یہ بھی ہے کہ مسلمان جن کی نگاہوں کو خود تجلیاتِ باری تعالےٰ تلاش کرتی پھرتی تھیں، وہ نگاہیں آج سراسر غرقِ مجاز اور آلودۂ ہوس ہونے کی بنا پر اس قدر پست اور کوتاہ بیں ہو چکی ہیں کہ دیدارِ الٰہی اور نورِ وادیٔ ایمن تک نہ تو اُن کی رسائی ہے اور نہ اُس نور کو دیکھنے کی تمنّا ہی باقی ہے کہ اللہ تعالےٰ رہنمائی فرمائے۔ حاصل یہ کہ مسلمان مادہ پرستی اور ملحدانہ رجحانات کی وجہ سے روحانیت اور یقین و ایمان سے محروم ہو چکا ہے۔ اُسے دیدارِ الٰہی کی کوئی اُمید نہیں اور اگر ہے تو عمل میں اس احساس کا ثبوت کیوں نہیں ملتا؟ چنانچہ اس نظم میں کچھ آگے چل کر شمع کا مُسلمان سے مطالبہ ہے کہ:۔

خیمہ زن ہو وادیِ سینا میں مانندِ کلیمؑ
شعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر!

یعنی اے مسلمان! دِل میں نورِ الٰہی اور دیدارِ الٰہی کی تڑپ دوبارہ پیدا کر، اور طُور کی وادی میں مثلِ کلیمؑ خیمہ زن ہو تاکہ تجلّیاتِ باری تعالیٰ تجھ پر بے نقاب ہوں۔ اور یہ چیز ممکن نہیں تا وقتیکہ تو اپنے شعلۂ تحقیق (یعنی معرفتِ حق) سے کاشانۂ باطل کو جلا کر راکھ نہ کردے۔

"وادیِ سینا" میں خیمہ زن ہونے کا جو حکم ہے اس سے یہ مُراد ہرگز نہیں کہ انسان ضرور اُس پہاڑ پر جاکر مقیم ہو اور بن باسی بن جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ مادی اور نفسانی دُنیا سے قدرے کنارہ کشی اختیار کی جائے اور کسی روحانی مرکز مثلاً مسجد یا ممکن ہو تو بیت اللہ شریف میں نماز اور ذکرِ الٰہی کی مزاولت کی جائے تاکہ روحانی اور قلبی بیداری حاصل ہو!

ہم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طُور تو موجود ہے موسےٰؑ ہی نہیں ص ۲۲۴

یہ شعر "جوابِ شکوہ" میں سے ہے۔ اور "شکوہ" کے اس شعر کا جواب ہے:-

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بے چارے مُسلماں کو فقط وعدۂ حُور

"جلوۂ طُور تو موجود ہے موسےٰؑ ہی نہیں" یعنی میرا جلوہ اور میری گوناں گوں نعمتیں تو عام ہیں لیکن آرزومند دل اور طلب کرنے والے ہاتھ ہی آگے نہیں بڑھتے!

اور اب ذکرِ طور و کلیمؑ کا آخری شعر یہ ہے کہ:-

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیمؑ
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر! ص ۳۱۹

اس شعر سے علامہ اقبالؒ کا مقصد دراصل اپنے فلسفۂ خودی کی ترجمانی ہے۔ بالفاظِ دیگر ایک مثال کے رنگ میں "خودشناسی" یا "عرفانِ نفس" کی تاکید کی جارہی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ دیگر مخلوقات کے جذب و کشش سے متاثر ہوتے، اُن کی جانب دوڑ دوڑ کر جاتے، بلکہ خود دیدارِ خالق کے لئے کسی دُور دراز جگہ کی طرف بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دُنیا کا جمال، کائنات کے تمام محاسن، کشش کے تمام عناصر، اور تجلّیات کا عظیم ترین مرکز تمہارے اپنے سینہ میں ہے۔ لہٰذا دوسروں سے سوال کرنے کی بجائے اپنے دل سے وہ کمالات پیدا کرو جن کی انسانی زندگی کو ضرورت ہے۔ غیروں کو دیکھنے اور اُن کی پرستش کرنے سے پہلے خود کو پاؤ، اور اپنے جمالِ فطرت کی پرستش کرو۔ یہی "خودی" کا مفہوم ہے، اور یہی مطلب ہے اقبالؒ کے اس شعر کا:-

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں!

"بانگِ درا" میں "طور و کلیم" کے متعلق تمام اشعار یہاں ختم ہوگئے، لہٰذا اب اشارات کے ذیل میں دیگر مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی بتا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا ص۵

یہ شعر نظم "ہمالہ" سے ہے۔ "آبائے انسان" سے مراد حضرتِ آدم ہیں۔ مستند تفاسیرِ قرآن کی رُو سے حسبِ حکمِ الٰہی جب روئے زمین پر ہبوطِ آدم ہُوا تو حضرت آدم سراندیپ میں اُترے، حوّا جدّہ میں، ابلیس ایلہ میں جو بصرہ کے اطراف میں ہے، اور سانپ اصفہان میں۔ ممکن ہے بعد میں ہمالہ کے دامن بھی آدم یا اولادِ آدم کا مسکن رہے ہوں۔

سرِ پہ سبزہ کے کھڑے ہوکے کہا "قُم" میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسّم میں نے! ص۱۲

یہ شعر نظم "ابرِ کوہسار" سے ہے۔ یہاں شاعر نے بطور استعارہ یا کنایہ ابر کو مسیح ابنِ مریمؑ قرار دیا ہے، جو مُردہ اجسام پر "قُم باذن اللہ" کا حکم صادر فرماتے تھے۔ اور وہ زندہ ہوکر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ یہ "قُم" گویا اُس قُم کی جانب اشارہ ہے۔ بادل نے قُم کا آوازہ بلند کیا اور پژمُردہ سبزہ اُسے سنتے ہی زندہ اور تر و تازہ ہوگیا!

علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں ص۲۸

یہ شعر نظم "عقل و دل" میں سے ہے۔ عقل جب اپنے کمالات کی ڈینگ مارتی ہے تو دل اُسے جواب دیتا ہے کہ علم کا نتیجہ اضطراب اور بے چینی ہے۔ مگر اس بے چینی کو فقط میں ہی رفع کرکے

انسان کو سچا اطمینان عطا کرتا ہوں۔ مصرعِ اوّل میں اشارہ ہے اس مقولے کی طرف کہ "العلم حجاب الاکبر" یعنی علم بجائے کشفِ حقیقت کے بذاتِ خود مقصود کے درمیان پردہ بن جاتا ہے۔

صبحِ ازل جو حُسن ہُوا دلستانِ عشق
آوازِ کُن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق ص۴۳

یہ شعر نظم "شمع" کے تحت واقع ہُوا ہے۔ اس کی سادہ اور عام فہم ترتیب نثر یوں ہو گی۔ "کائنات کی پیدائش کے روز جب حُسن نے عشق کے دل کو لبھایا، تو آوازِ "کُن" نے روحِ عشق میں حرارت پیدا کر دی۔"

قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے کائنات کو پیدا کرنا چاہا تو فرمایا "کُن"! یعنی "پیدا ہو جا!" یہ کہتے ہی "فیکون" یعنی تمام چیزیں پیدا ہو گئیں۔

اقبالؔ کا مقصد یہ ہے کہ عاشق حُسنِ ازل کے دل میں جو تپش اور بے چینی پیدا ہوئی، وہ بھی حکمِ کُن ہی کے تحت ظہور میں آئی، اور اس طرح حسن نے اپنی شانِ کشش کا اتمام کیا!

ہاں آشنائے لب نہ ہو رازِ کہن کہیں
پھر چھِڑ نہ جائے قصّۂ دار و رسن کہیں ص۴۴

یہ نظم "شمع" کا آخری شعر ہے۔ فرماتے ہیں کہ رازِ کہن یعنی "انا الحق" ہونٹوں تک ہرگز نہ آنے پائے، ورنہ عوام اس راز کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہوئے عاشق کے لئے دار و رسن کی تیاری شروع کر

یں گئے۔ منصور کے پھانسی پانے کی طرف اشارہ ہے۔

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوّتِ فرماں رواکے سامنے بے باک ہے ص۴۳

یہ شعر نظم "سیّد کی لوحِ تربت" سے ہے۔ مصرع دوم اس حدیث کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ: لِمَۃُ الْحَقِّ عِنْدَ السُّلْطَانِ الْجَابِرِ اَجْرُ مِائَۃِ شَہِیْدٍ۔ یعنی ظالم وجابر بادشاہ کے امنے حق بات کہنا سو شہیدوں کا ثواب رکھتا ہے!

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو! ص۴۳

یہ شعر بھی مندرجہ بالا نظم میں سے ہے مصرع اوّل کے الفاظ "تلمیذِ رحمانی" میں اشارہ کیا گیا ہے ں مقولہ کی طرف کہ اَلشُّعَرَاءُ تَلَامِیْذُ الرَّحْمٰنِ۔ یعنی "سچے شاعر خدا کے شاگرد ہوا کرتے ہیں" حاصل متقی شاعر کے جذبات اور خیالات کا منبعِ فیض سراسر الہام ربّانی ہے۔

جو شخص "تلمیذِ رحمانی" ہے، وہ نہ صرف خود قوانینِ الٰہیہ اور نوامیس شریعت کا پابند ہوگا، بلکہ اُس کا ام بھی فسق وفجور، رندی واوباشی اور تضاد واختلاف سے قطعی طور پر مبرّا ہوگا!

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بوجھ جو مجھ سے نہ اُٹھا وہ اُٹھایا تو نے

یہ شعر نظم "انسان اور بزمِ قدرت" میں سے ہے۔ کائنات میں سے خصوصاً آفتاب اور اُس

کے مسکن یعنی آسمان کی بہت تعریف کرتے ہوئے اُن کی آزادی اور ضیا پاشی پر رشک کرتے ہیں، اس پر خورشید جواب دیتا ہے کہ غم مت کر کیونکہ تیرے ہی وجود سے میری بود و نبود وابستہ ہے۔ اگر تو نہ ہوتا تو کائنات کی کوئی شے بھی نہ ہوتی۔ جو کچھ بنا ہے تیری ہی خدمت کے لئے بنا ہے اور تو سب کا آقا ہے تو نے میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا ہے، اور جو بوجھ مجھ سے نہ اُٹھ سکا، وہ تو نے اُٹھایا۔ مصرع دوم میں اشارہ ہے اس آیۂ قرآنی کی جانب:۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ (پ ۲۲ - ۵ - ع)

ترجمہ:۔ ہم نے اپنی امانت (احکامِ الٰہی) آسمان، زمین، اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی۔ مگر انہوں نے یہ بوجھ (تکلیفِ شرعی)) اُٹھانے سے انکار کر دیا، اور اُس (کی ذمہ داریوں) سے ڈر گئے۔ آخر انسان نے یہ بوجھ اُٹھالیا۔ درآں حالیکہ وہ اس کی تعمیل میں ظالم اور جاہل ہے۔"

حُسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل ۱۲۵

یہ شعر نظم "دل" کے تحت واقع ہوا ہے۔ اس موضوع کے متعلق "بانگِ درا" میں چونکہ متعدد جگہ اشارات پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا قصّے کا ایک خاکہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

خسرو (نام پرویز بن ہرمز بن نوشیرواں کا) کے عہد میں شیریں ایران کی ایک نہایت حسین و جمیل

لڑکی تھی، اور اُس کے حُسن کا شہرہ دُور دُور تھا۔ خسرو اُس کو دل و جان سے چاہتا تھا اور ارادہ رکھتا تھا کہ اُس سے شادی کرلے۔ دوسری جانب فرہاد ایک غریب مگر صاحبِ فن سنگ تراش نوجوان شیریں کے حُسن پر فریفتہ تھا۔ اور شیریں بھی اُس کی دلدادہ تھی۔ خسرو نے مختلف طریقوں سے بہت سازشیں کیں کہ اُس کا رقیب فرہاد کسی نہ کسی طرح اُس کے راستے سے ہٹ جائے اور وہ شیریں کو مکمل طور پر اپنی طرف مائل کرلے۔ مگر شیریں چونکہ محض زر و جواہر اور تخت و تاج کی پرستار نہیں تھی، اور فرہاد کی غربت، مگر بے لوث، معصوم اور پُرجوش جوانی کو چاہتی تھی۔ لہٰذا وہ خسرو سے متنفر رہی، آخر کار خسرو نے تنگ آکر فرہاد سے یہ شرط باندھی کہ اگر وہ اُس کا قصر مطلوبہ طرز پر تعمیر کردے، تو وہ شیریں سے دست بردار ہو جائے گا اور اجازت دے گا کہ فرہاد سے شادی کرلے۔ چنانچہ فرہاد اس شرط میں بھی پورا اُترا، اور مُدّتِ معیّن کے اندر اندر شب و روز کی محنت شاقہ سے قصرِ خسروی تعمیر کردیا[1]۔ خسرو نے یہ دیکھ کر اپنی شکستِ فاش محسوس کی اور بہت گھبرایا۔ بعد ازاں اُس نے ایک اور کڑی شرط عائد کی، اور وہ یہ کہ فرہاد جب کوہِ بے ستون سے ایک نہر (جوئے شیر[2] جو غالباً "جوئے شیریں" یعنی میٹھے پانی کی نہر ہوگا) نکال لائے گا تو شیریں بلا حیل و حجّت اُس کے سپرد

[1] غالبؔ نے اسی موقع کے لئے کہا ہے، اور خوب کہا ہے:-

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب — ہم کو منظور نکو نامیِ فرہاد نہیں

[2] یہ روایت عموماً مشہور ہے کہ فرہاد نے دودھ کی نہر جاری کی، جو سراسر ایک بے معنی اور مضحکہ خیز سی چیز ہے۔ پہاڑ میں سے جوئے شیریں (میٹھے پانی کی نہر) تو جاری کی جا سکتی ہے، لیکن دودھ کے چشمے اُس میں کہاں (باقی صفحہ ۳۰ پر)

کردی جائے گی۔ چنانچہ فرہاد نے یہ شرط بھی بخوشی منظور کی، اور تیشہ لے کر کوہ بے ستون پر جا پہنچا۔ شب و روز کی مسلسل ضربات سے اُس نے جُوئے شیریں جاری کردی اور شرط میں کامیاب و سرفراز رہا۔ اب خسرو نے نجات کی کوئی صورت نہ دیکھ کر ایک آخری مگر خطرناک چال چلی۔ وہ یہ کہ ایک بڑھیا کو بہت سی نقدی دے کر اس ذلیل اور بد دلانہ سازش پر آمادہ کیا کہ وہ کوہ بے ستون پر فرہاد کے پاس جائے اور پہلے تو اُسے جُوئے شیریں کی تکمیل پر مبارکباد دے، لیکن بعد میں روتی صورت بنا کر اُسے یہ خبر سُنائے کہ شیریں کچھ روز بیمار رہ کر اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئی ہے۔ چنانچہ بڑھیا ان ہدایات پر عمل کرتی ہے۔ فرہاد بڑھیا کی زبانی جونہی شیریں کی خبرِ وفات سُنتا ہے۔ اپنے سر میں تیشہ مار کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ آہ! جس تیشہ نے شب و روز کی پیہم کدو کاوش سے جُوئے شیریں جاری کر دکھائی، وہی تیشہ آج اپنے آقا کے سر سے جوئے خون جاری کر کے اُس کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیتا ہے۔ غالب اسی موقع و محل پر پیرزن کے لئے نفرت و حقارت اور فرہاد کے لئے محبت و احترام کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:۔ ؎

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پاؤں ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

(بقیہ صفحہ ۲۹) جو طوفان کی صورت میں نہر نکلیں گے۔ بہر کیف راقم الحروف کے نزدیک یہ نہر یقیناً "جوئے شیریں" ہوگی۔ س میں سے دو معقول اور قابلِ قبول مفہوم پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو میٹھے پانی کی نہر، اور دوسرے وہ نہر جو شیریں کے م پر جاری کی گئی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نسبت اور تصور فرہاد جیسے عاشق صادق کے لئے تسخیرِ مقصد میں پرِ پرواز کا ام دے گئے۔ اور وہ اس مہم میں بھی کامیاب رہا۔

یعنی بیچارے فرہاد نے اپنی سادہ لوحی اور بھولے پن میں جان دے دی۔ اور واقعہ کی تحقیق تک نہ کی۔ افسوس! ایسی شریر بڑھیا کے پاؤں کیوں نہ ٹوٹ گئے کہ وہ یہ مصنوعی خبر فرہاد تک نہ پہنچا سکتی۔

بہرکیف حسبِ روایت جب شیریں نے اس سازش کے تحت فرہاد کی خبرِ وفات سُنی تو اُس نے بھی خودکشی کر لی، اور اپنے محبوب سے جا ملی۔ رقیبِ سیاہ رو (خسرو) اپنی محرومی و ناکامی پر بے حد نادم ہُوا۔ اور بعد میں اُسے احساس ہُوا کہ کاش! یہ جوڑا اس قدر المناک نتائج کی نسبت خوشگوار طریق پر ملحق ہو جاتا تو بہتر تھا۔ مگر خسرو کی یہ حسرت و ندامت کسی جہت سے بھی سود مند نہ تھی۔ اب اقبال کا یہ شعر دوبارہ پیشِ نظر لائیے:۔

حُسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تُو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

فرہاد کی مثال درمیان میں لا کر عام عشاق اور پرستارانِ حُسن کو تلقین کی جا رہی ہے کہ ہمہ وقت بُت پرستی اور غیر جوئی و غیر بینی کی نسبت اگر وہ اپنے حُسنِ فطرت اور نورِ قلب کی طرف نظر اُٹھائیں تو دُنیا کے ہر حُسن سے بے نیاز ہو جائیں۔ گویا "خودی" کا وہی نکتہ ہُوا کہ:۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی؟

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بے ستوں بھی، کوہکن بھی ہے صہ۳۱

یہ شعر نظم "تصویرِ درد" کے تحت واقع ہُوا ہے۔ "وہی حسن" سے مراد حسنِ باری تعالےٰ ہے۔ فرماتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز میں حسنِ خالق کی جھلک پائی جاتی ہے۔ شیریں کے حسن میں فرہاد کے جذبۂ عشق میں، اور بے ستون کی تسخیر میں بھی اُسی کی تجلّیات کارفرما ہیں۔

اُس حسن کا ہر "شے" میں نظر آنا عقیدۂ "ہمہ اوست" کی ترجمانی کر رہا ہے، اور سچ پوچھئے تو قرآن حکیم کے بعض اشارات بھی اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں کہ خدا کا جلوہ ہر جگہ موجود ہے۔ مثلاً:۔ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ "تم جس طرف بھی منہ کرو، وہیں خدا کا چہرۂ جمیل موجود پاؤ گے۔" اور "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔"

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ صہ۲۳۳

یہ شعر نظم "تعلیم اور اُس کے نتائج" کی ذیل میں مندرج ہے۔ یہاں پرویز سے مراد نوجوان مسلم ہے اور شیریں سے مراد تعلیم مغربی۔ فرماتے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں نے تعلیم جدید اس لئے حاصل کی تھی، کہ اُس سے تہذیب اور فارغ البالی حاصل ہو۔ لیکن اس کے برعکس اس قدر آزادی و بدتہذیبی اور لادینی و الحاد کا دور دورہ ہے کہ نتائج تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں۔ اور یہ شیریں (تعلیم جدید) ہمارے فرہاد (مسلم نوجوان) کی خودکشی کے لئے گویا ایک تیشہ بھی اپنے ساتھ لائی ہے۔ جس نے

داستانِ ملت کو نہایت المیہ بنا دیا ہے۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی ص ۲۹۳

یہ شعر عنوان "زندگی" کے تحت واقع ہوا ہے، اور خضر شاعر کو بتاتا ہے کہ تسخیرِ زندگی کس قدر محنت و مشقت کی متقاضی ہے۔ سنگِ گراں میں سے جوئے شیر پیدا کرنا انتہائی محنت اور استقلال کا ثبوت ہے۔ حاصل یہ کہ انسانی زندگی غالب و مختار اور کامیاب و کامران نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ سخت کوشی، اولوالعزمی اور عالی ہمتی نہ ہو۔ بالفاظ دیگر زندگی "جفا طلبی" ہی کا دوسرا نام ہے۔ جیسا کہ ذیل کے شعر میں فرمایا:۔

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بہ کعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است

یا جیسا کہ:۔

عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چوں خلیل از شعلہ گُل چیدن خوش است

میں اُچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہ کامل سے
جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے

یہ شعر عنوان "موجِ دریا" کے تحت واقع ہوا ہے۔ پہلے مصرع میں سائنس کے ایک جدید نظریہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ نظریہ یہ ہے کہ سمندر کی موجوں میں حرکت اور تلاطم چاند کی کرنوں سے پیدا ہوتا ہے۔ چاند میں پانی کے لئے کچھ ایسی طبعی کشش ہے کہ موجیں خود بخود اُس کی جانب اُچھلنے لگتی ہیں، اور اس طرح بحر میں طوفان کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اقبال جیسے محقق فلسفی نے جو یہ مسئلہ یہاں بیان کیا ہے تو یہ کیسی گہرے اور مستند مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ بہر کیف موج کی اُچھل کود سے یہی شاعر نے حسنِ تعلیل کے طور پر ایک حکیمانہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور وہ یہ کہ :-

زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

موج اور چاند کے درمیان کشش کا یہ مسئلہ "بانگِ درا" کے ایک اور شعر میں بھی مذکور ہے، اور وہ اس طرح کہ :-

میرے ویرانے سے کوسوں دُور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن ص۷۶

یہ شعر نظم "چاند" میں سے ہے، اور شاعر چاند کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہتا ہے فرماتے ہیں کہ ایک نورِ معرفت اور تعلقِ معنوی کے تحت میرا دریائے دل نورِ ماہتاب سے موجزن ہے۔ اسی مفہوم کو دوسری جگہ واضح تر الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے :-

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اسکی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود ص ۵۹

اس شعر میں اشارہ ہے اس مقولہ کی طرف کہ اَلعِلمُ حِجَابُ الاَکبَر یعنی علم بذاتِ خود مقصودِ حقیقی کے درمیان پردہ ہے، اور باعثِ حیرت و تشویش!

بہرکیف اس شعر میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ فقط نظری علم سے انسان کی طبیعت کو اطمینانِ کُلّی نصیب نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ وہ عجائباتِ قدرت کا عمیق مشاہدہ کر کے عرفان اور عین الیقین کا درجہ حاصل نہ کرے!

پریشاں ہوں میں مُشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں، یا گردِ کدورت ہوں ص ۶۲

یہ شعر عنوان "تصویرِ درد" کے تحت واقع ہوا ہے۔ اور اس روایت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آئینہ درحقیقت سکندر کی ایجاد ہے۔

مفہوم شعر یہ ہے کہ محض عقل کی سحرکاری اور مادی اسباب کی اُلجھن میں انسانی طبیعت اس حد تک منتشر ہوچکی ہے کہ آنکو مقصدِ زندگی ہی عیاں نہیں ہوتا۔ اور دل فکر و نظر کے

ایک مرکز سے محروم ہے۔

اِسی اشارے کے تحت ایک اور شعر ہے:۔

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمالِ شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں، تو بھی آئینہ ساز ہو جا ص ۱۳۸

یعنی دنیا میں کسی کمال کی تحصیل جاہ و حشم یا تاج و تخت ہی پر منحصر نہیں ہے۔ مانا کہ سکندر نے آئینہ ایجاد کیا تھا لیکن آج تیرے سینے میں بھی وہ سرمایہ موجود ہے جس سے تو بھی نئی قیمتیات اور نوادرِ روزگار کا موجد بن سکتا ہے۔ صرف اپنے نورِ باطن، اپنے شعور، اور اپنی اجتہادی قوتوں کو عمل میں لانے کی دیر ہے کہ طرزِ تخلیق اور سامانِ تخلیق ہر دو چیزیں خود بخود تجھ پر منکشف ہو جائیں گی!

نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی!
مَیں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں ص ۶۴

یہ شعر نظم "تصویرِ درد" میں سے ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اشارہ ہے حضرت علیؓ کے اس اس مقولہ کی طرف کہ:۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔

یعنی "جس نے اپنے نفس کے حقائق کو پہچان لیا اُس نے گویا خدا کو پہچان لیا۔" اسی بنا پر فرماتے ہیں کہ حق کا عرفان سیرِ عرصۂ ہستی یعنی کائناتِ عالم کی سیر ہی پر موقوف نہیں، بلکہ میں بذاتِ خود چھوٹی سی دنیا ہونے کے باوجود اس قدر وسیع "ولایت" ہوں کہ جس کے

عجائباتِ معنوی کی کوئی انتہا نہیں۔ اور جب اپنی حقیقت تک رسائی حاصل کر لوں، تو پھر خدا کو بھی بآسانی پا لوں گا۔ بقول میر:-

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے پاس
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

یہی آئین قدرت ہے، یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

سراسر "عمل" ہی کو آئینِ قدرت اور اسلوبِ فطرت قرار دینے میں صریحاً اشارہ ہے اس آیۂ قرآنی کے مضمون کی طرف کہ:- لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ یعنی انسان کے لئے وہی کچھ ہے جسے وہ اپنی محنت و سعی سے حاصل کر لے۔ پس۔ ع:-

جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بُتِ پندار کو اپنا خدا تو نے صفحہ ۶۹

یہ شعر بھی نظم "تصویرِ درد" میں سے ہے۔ زباں سے توحید کا دعویٰ کر لینے کے باوجود غرورِ نفس اور خواہشاتِ نفس کو اپنا خدا بنا نا شرکِ خفی ہے۔ جو شرکِ جلی سے بھی گری ہوئی چیز ہے۔ لہٰذا اس مضمون میں اشارہ ہے اس آیۂ قرآنی کی طرف:- أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُۥ هَوَىٰهُ

یعنی "اے نبیؐ! کیا تو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ہوا و ہوس ہی کو اپنا معبود بنا لیا ہے"۔
الغرض :-

خرد نے کہہ بھی دیا لَا اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

کنوئیں میں تو نے یوسفؑ کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل! جو مطلق تھا مقیّد کر دیا تو نے ص ۶۹

یہ شعر بھی نظم "تصویرِ درد" میں سے ہے۔ اس میں اشارہ ہے حضرت یوسفؑ اور اُن کے بھائیوں کے عبرت انگیز قصے کی طرف۔ قرآن حکیم میں مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نہ صرف حسنِ صوری بلکہ حُسنِ معنوی (اخلاق و صفات) کی بنا پر حضرت یعقوبؑ کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔ اور اس بناء پر دیگر بھائی انہیں نفرت اور حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ ایک رات جب حضرت یوسفؑ نے یہ خواب دیکھا کہ مجھے سورج، چاند اور بارہ ستارے سجدہ کر رہے ہیں تو حضرت یعقوبؑ نے انہیں تلقین کی کہ یہ خواب بھائیوں کے سامنے ہرگز بیان مت کیجیو، ورنہ وہ تجھ سے فریب کریں گے، اور کسی نہ کسی طرح ایذا پہنچائیں گے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے والدِ محترم کے حکم کی تعمیل کی۔ بایں ہمہ بھائیوں کا جذبۂ حسد رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اور ایک روز اُنہوں نے حضرت یعقوبؑ سے تقاضا کیا کہ وہ یوسفؑ کو شکار کے لئے اُن کے ہمراہ بھیجیں۔ اُنہوں نے انکار کیا۔ لیکن پیہم اصرار پر بادلِ

ناخواستہ اجازت دے دی، اور نگہداشت کی تاکید کی۔ بیٹوں نے سینہ ٹھونک کر اطمینان دلایا کہ ہم جیسے قوی ہیکل اور ہیبت ناک جوانوں کے ہوتے کسی کی مجال نہیں کہ یوسفؑ کے قریب بھی پھٹک سکے۔

وہ شکار کے لئے رخصت ہوئے اور جنگل میں پہنچ کر اپنے عہد کی تعمیل اس طور پر کی کہ یوسفؑ کے کپڑے اتار اسے تو کنویں میں پھینک دیا، تاکہ بھوک پیاس سے وہیں دم توڑ دے، اور خود قمیص کو بکری کے خون میں تر کر کے شام کے وقت روتے ہوئے باپ کے سامنے آکھڑے ہوئے اور کہا "ہم تو شکار میں محو تھے، اُدھر ایک ظالم بھیڑیا آیا اور یوسفؑ کو چیر پھاڑ کر کھا گیا۔ یہ خون میں لتھڑی ہوئی قمیص ہماری صداقت پر شاہد ہے۔"

بہر کیف چونکہ شعر سے متعلق اس قصہ کی جزئیات اسی حد تک ختم ہو جاتی ہیں لہٰذا ہم اسے بلا ضرورت طول دینا نہیں چاہتے۔ اب شعر کو دوبارہ پیش نظر لائیے گا:-

کنویں میں تو نے یوسفؑ کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل! جو مطلق تھا مقیّد کر دیا تو نے

اشارات سمجھ لینے کے بعد اب یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ "یوسفؑ" اس شعر میں استعارہ ہے جس سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے۔ اسی طرح کنویں سے مراد عالم لاہوت ہے۔ فرماتے ہیں کہ تو نے جب ہستی باری تعالیٰ کو محض عالم لاہوت یا لامکاں تک محدود رکھا اور مخلوقات میں اس کی موجودگی سے انکار کیا تو گویا ایک آزاد ہستی کو مقیّد کرنے کی کوشش کی۔ پس حد بندی اور

تعیّن اللہ تعالیٰ کی وسعت اور ہمہ گیری کے سراسر خلاف ہے۔ لہٰذا اُس یوسفؑ کو صرف کنویں ہی میں نہیں دیکھنا چاہیئے۔ بلکہ اُس کا پرتوِ حُسن کائنات کی ہر چیز میں موجود ہے۔

اگر دیکھا بھی اُس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو ص۸۲

"جم" جمشید کا مخفف ہے، جو فارس کا بادشاہ تھا۔ اُس نے ایک بہت بڑا جام بنوایا تھا جسے "جامِ جہاں نما" اور "جامِ جہاں بیں" بھی کہا جاتا ہے۔ اُس جام میں ہندسے اور خطوط اس انداز سے کندہ کئے گئے تھے جن سے حوادثِ روزگار اور احوالِ عالم کا خیر و شر معلوم ہو جاتا تھا۔ اس کی کیفیت ایسی تھی جیسے اصطرلاب کے خطوط اور رقوم سے ستاروں کا حال معلوم ہوتا ہے۔

بہرکیف حضرتِ علامہ فرماتے ہیں کہ جمشید نے "جامِ جہاں نما" میں تمام دنیا کی کیفیت دیکھ بھی لی تو کیا ہُوا۔ مزا تو جب تھا کہ اُس میں اپنی حقیقت کا بھی سراغ لگاتا، جس سے وہ سراسر محروم رہا۔

حاصل یہ کہ ہر وہ صنعت و حرفت، ہر وہ فن، اور ہر وہ ایجاد قطعاً ناکارہ ہے جو انسان کو "خودی" یا "انا" کی عظمت اور معرفت سے دُور رکھے۔

تجھے نظارے کا مثلِ کلیمؑ سودا تھا
اویسؓ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا ص۷۹

یہ شعر نظم "بلالؓ" کے تحت واقع ہُوا ہے۔ مصرعِ اوّل میں حضرت بلالؓ سے خطاب ہے کہ

آپ دیدارِ رسولؐ کے لئے یوں بے تاب رہتے تھے جیسے حضرتِ موسیٰؑ تجلّیِ باری تعالیٰ کے لئے، اسی طرح دوسرے مصرعہ میں اویس قرنی کے عشقِ رسولؐ کی جانب اشارہ ہے۔

اویسؒ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے اور قرن کے باشندے تھے جو ایک قریہ کا نام ہے ملک یمن میں۔ وہ آنحضرتؐ کی زیارت کے لیے حد مشتاق تھے لیکن ضعفِ پیری اور ضعفِ بصری کی وجہ سے مدینہ منوّرہ میں حاضر نہ ہو سکے اور دُعا کے لئے درخواست کر بھیجی یہی مطلب ہے اس مصرعہ کا کہ۔

اویسؒ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر ص ۷۹

یہ شعر بھی نظم "بلالؓ" میں سے ہے۔ فرماتے ہیں کہ تیری بے صبر روح پر عشقِ رسولؐ کی وہ بجلی گری کہ جس کی روشنی ید بیضا کو بھی شرمانے لگی۔ ید بیضا کی روایتی تحقیق یہ ہے کہ جب حضرتِ موسیٰؑ دس سالہ ہجرت کے بعد مدین سے مصر کو واپس ہوتے ہیں تو وادیٔ طویٰ میں ایک درخت کے نیچے انہیں اللہ تعالےٰ سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہُوا، اور معجزہ عصا (جو اژدہا بن جاتا تھا) کے ساتھ ساتھ انہیں ید بیضا کا معجزہ بھی عطا کیا گیا، اور اس موقع پر اللہ تعالےٰ نے حکم فرمایا:۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ (پ ۱۶ : ع ۱)	"اے موسیٰؑ! اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال، وہ بغیر کسی عارضہ کے سفید اور منوّر ہو کر باہر

نکلے گا۔ یہ ہماری دوسری نشانی ہے۔"

چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے ایسا ہی کیا، اور یہ معجزہ فرعون اور آلِ فرعون کے سامنے پیش کرتے رہے۔ اسی اشارہ سے متعلق "بانگِ درا" میں دو تین اشعار اور بھی ہیں۔ چنانچہ :۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں گویا آستینوں میں ص ۱۰۸

یعنی خرقہ پوش اور اللہ مست درویشوں سے اگر تجھے عقیدت ہے تو بہ نظرِ غائر ان کے روحانی کمالات کا مشاہدہ کر۔ یہ بھی اپنی آستینوں میں گویا ید بیضا لئے بیٹھے ہیں، جو کفر و عصیاں سے تاریک دلوں کو ایک لمحے میں روشن کر سکتا ہے۔

جلوۂ طور میں جیسے ید بیضائے کلیمؑ
موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم ص ۱۲۱
ہے ترے سیلِ محبت میں یوں ہی دل میرا

یہ مثلث نظم "حسن و عشق" کے تحت واقع ہوا ہے۔ دو بدیع و نادر تشبیہات پیش کر کے شاعر نے یہ ربطِ معنوی پیدا کیا کہ :۔

ہے ترے سیلِ محبت میں یوں ہی دل میرا

سرگزشتِ آدم!

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بُھلایا قصّۂ پیمانِ اوّلیں مَیں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنّت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں مَیں نے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں مَیں نے
رہا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں مَیں نے
نکالا کعبے سے پتھّر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بُتوں کو بنایا حرم نشیں مَیں نے
کبھی میں ذوقِ تکلّم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں مَیں نے
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں مَیں نے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربانی
پسند کی کبھی یوناں کی سر زمیں میں نے
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے
بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیِ تعلیم اہلِ دیں میں نے
لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقلِ دور بیں میں نے

کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو
بنادی غیرتِ جنّت یہ سرزمیں میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ، رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے
ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اُسے مکیں میں نے

یہ نظم اوّل سے آخر تک تاریخِ عالم کے نہایت اہم، ہنگامہ خیز اور عظیم الشان اشارات سے معمور ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ہر شعر میں حُسنِ واقعہ اور حُسنِ مضمون کی جانب نہایت بلیغ اشارہ کیا گیا ہے۔ اور نپے تُلے الفاظ میں اُس کا حق ایسے دلپذیر انداز میں ادا ہُوا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصوّر میں نہیں آسکتا۔ مجموعی طور پر صرف پندرہ اشعار میں نہ صرف آفرینش سے لے کر انبیاء اور معجزات کی جانب اشارات ہیں، بلکہ سائنس کے جدید انکشافات کا تذکرہ بھی ہے۔ بنابریں تاریخی اور علمی حیثیت سے یہ نظم معلومات کا ایک بیش بہا مخزن ہے لیجے اب باری باری ان اشعار کے اشارات ملاحظہ فرمائیے:۔

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قِصّۂ پیمانِ اوّلیں میں نے

"غربت" سے مراد یہ ہے کہ حضرتِ آدمؑ جنّت سے محروم کرکے زمین پر اُتار دیئے گئے۔

حسبِ آیاتِ قرآنی بابا آدمؑ اور اماں حوّا کو اللہ تعالیٰ نے کھلی اجازت دے رکھی تھی کہ جنّت کی جو نعمتیں بھی چاہیں بہ فراغت استعمال کریں۔ لیکن ایک خاص درخت (گیہوں) کو نہ چھوئیں۔ وہ اس حکم کے پابند رہے، لیکن شیطان نے انہیں ترغیب دی اور گیہوں کھلا کر چھوڑا۔ پس عتابِ الٰہی نے اس جوڑے کے لئے سزا یہ تجویز کی کہ وہ زمین پر اُتر جائیں اور پھر اُن کی اولاد نیکی اور بدی یا خیر و شر کا امتیاز کرتے ہوئے احکامِ الٰہی کی پابندی اختیار کرے۔ حلال و جائز چیزیں استعمال کرے۔ لیکن حرام و ممنوع اشیاء سے پرہیز کرے، اور اس اصول پر جزا و سزا کا قانون مرتّب ہوا۔

بہر کیف مصرعِ اوّل میں یہ ہے آدم کی "داستانِ غربت"۔ اب مصرع دوم پر غور کیجئے تو اس میں "پیمانِ اولیں" سے مراد عہدِ الست ہے۔ جب حیاتِ دنیوی کے لئے تمام روحیں پیدا ہو چکیں، تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے پوچھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں"؟ اُنہوں نے جواب دیا "بَلٰی" یعنی "بے شک تو ہی ہمارا پروردگار اور معبودِ برحق ہے"۔ اس معاہدہ سے مقصد اتمامِ حجّت تھا کہ آئندہ کبھی کوئی روح توحیدِ باری تعالیٰ اور اُس کی ربوبیّت سے منکر نہ ہو۔ پس ؏

"بھلایا قصّہ پیمانِ اوّلیں میں نے"

یہ ظاہر کرتا ہے کہ اولادِ آدم روزِ ازل کے اپنے سب سے پُرانے عہدِ بندگی کو فراموش کر چکی ہے۔ اور یہ کس قدر اندوہناک حقیقت ہے کہ مادی اسباب کی عارضی جھلک انسان کو روح کی دیانتداری

اور دائمی مسرّت سے محروم کر دے۔ کیا خوب فرمایا حضرت اکبرؔ نے :-

وہاں قَالُوْا بَلٰی یاں بُت پرستی
ذرا سوچو، کہا کیا تھا کیا کیا!

نکالا کعبے سے پتھّر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بُتوں کو بنایا حرم نشیں ہم نے

حسبِ آیاتِ قرآنی کعبہ یا بیت اللہ شریف کی بنیاد ابراہیمؑ اور اسمٰعیل علیہ السلام نے رکھی تھی :-

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (پ۱ : ع۱۵)

ترجمہ :- "اور جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے باہم مل کر ہمارے گھر (خانۂ کعبہ) کی بنائیں استوار کیں، تو انہوں نے حضورِ حق یہ دعا کی، کہ پروردگار! ہماری یہ (دینی اور روحانی) خدمت قبول کر، تو ہی (دعاؤں کا) سننے والا، اور (حقیقتِ حال کا) جاننے والا ہے۔"

کعبہ کی تعمیر سے دُنیا کے اُس موحدِ اعظم کا مقصد یہ تھا کہ اس میں نماز پڑھی جائے، ذکرِ الٰہی کیا جائے۔ اور اصولِ توحید کی مکمل طور پر پابندی کی جائے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ امتدادِ

زمان اور مرورِ ایّام سے انسانیت کا عقیدۂ توحید ضعیف ہوتا چلا گیا، اور محض توہمات کی بنا پر اُس کی جگہ دیوتا، قوم کے مردہ بزرگ اور خیالی اوتار کارفرما ہونے لگے۔ اس طرح جو دل اور جو دماغ فقط ایک ہی معبود پر مرکوز رہتے تھے وہ بہت سے معبودوں اور حاجت رواؤں میں منتشر ہو کر اُن کے مجسمے تراشنے لگے اور پھر اُن مجسّموں کو عین کعبہ میں ایک خاص ترتیب سے سجاتے ہوئے یقین کر بیٹھے کہ یہی مقدّس جگہ ان کی روحانی شان وشوکت کے لئے زیادہ موزوں ہے، وہ بُت ساز اِن بُتوں کو اپنا مشکل کُشا سمجھ کر اُن سے مرادیں مانگتے تھے۔ جس وقت آنحضرتؐ کی بعثت ہوئی اُس وقت اِن بُتوں کی مجموعی تعداد تین سو ساٹھ بتائی جاتی ہے، جن میں سب سے ممتاز بُت ہبل، قبل، لات اور منات بتلائے جاتے ہیں، پس یہی مطلب ہُوا اس مصرعہ کا کہ :-

"کبھی بُتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے"

چنانچہ جب امام الانبیاء نے ہوش سنبھالا، اور انہیں حق و باطل کا شعور حاصل ہُوا تو عین بیت اللہ شریف کو شرک و بُت پرستی کا مرکز دیکھ کر انہیں نہایت قلق ہُوا۔ چنانچہ صاحبِ اقتدار ہوتے ہی آنحضرتؐ نے وہ تمام بُت کعبے سے نکال کر پاش پاش کر ڈالے۔ یہ ہے مفہوم اِن الفاظ کا کہ "نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی"!

کبھی میں ذوقِ تکلّم میں طُور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

اِس شعر میں حضرت موسےٰ کلیم اللہ کی جانب اشارہ ہے اور مفہوم و مقصد واضح "نورِ ازل" کو

زیرِ آستیں چھپانے کا مطلب ہے "یدِ بیضا"۔

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

اِس شعر میں حضرت عیسٰیؑ کی جانب اشارہ ہے۔ مسیح ابنِ مریم کا صلیب پر لٹکایا جانا، اور اور اُن کا پھانسی سے وفات پانا ایک عام رسمی عقیدہ ہے۔ اور غالباً اقبالؒ نے بھی اسے نقطۂ رسمی صورت ہی میں ذکر کیا ہے، ورنہ جہاں تک اسلامی عقائد اور قرآنی روایات کا تعلق ہے۔ حضرت عیسٰیؑ نہ تو قتل کئے گئے اور نہ اُنہوں نے پھانسی پائی۔ بلکہ پھانسی پانے والا شخص کوئی اور تھا جو اُن کا ہم صورت تھا۔ اور مشیّت ایزدی سے اصل عیسٰیؑ کے غائب ہونے ہی وہاں موجود پایا گیا قرآن حکیم واضح الفاظ میں فرماتا ہے کہ:۔ "مسیح ابنِ مریم کو نہ تو اُنہوں نے قتل کیا اور نہ پھانسی پر چڑھا سکے، بلکہ وہ لوگ شُبہ میں پڑ گئے (اور کسی دوسرے شخص کو پھانسی پر چڑھا دیا) حقیقت یہ ہے کہ اصل عیسٰیؑ کو اُنہوں نے یقینی طور پہ قتل نہیں کیا، بلکہ اُسے تو اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف (آسمان پر) اُٹھا لیا تھا۔"

پس عیسٰیؑ ابنِ مریم کا مصلوب ہونا عیسائیوں کا عقیدہ ہو تو ہو، اہلِ اسلام کا یہ عقیدہ نہیں۔ اور ہمارے نزدیک قرآن ہی کی خبر دُنیا کی ہر دوسری شے سے زیادہ مستند اور معتبر ہے، بہرکیف اقبالؒ کا اسلامی روایت کے حق میں ہونا دوسرے مصرعہ سے بخوبی عیاں ہے کہ:۔

کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی یَں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

اِس شعر میں خاتم النّبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی جانب اشارہ پایا جاتا ہے۔ حرا مکّہ معظّمہ میں ایک پہاڑ ہے، جس کے غار میں آنحضرتؐ تحصیلِ نبوّت سے پیشتر کئی سال ذکرِ الٰہی کرتے رہے، اور اس ذکر و عبادت سے دل میں عشقِ الٰہی اور نورِ توحید نشو و نما پکڑتا گیا، حتیٰ کہ ایک روز جبریل علیہ السّلام کا ورود ہُوا، جو مژدۂ پیغمبری دینے آئے تھے، چونکہ یہ ظہورِ روح الامین کا پہلا موقع تھا، لہٰذا اُس کے نور و جلال کو آنحضرتؐ برداشت نہ کر سکے، اور بخار کی حالت میں کانپتے ہوئے گھر تشریف لائے، اور بی بی خدیجہ سے اس "کملی والے" نے فرمایا۔ "زَمِّلُوْنِیْ! زَمِّلُوْنِیْ! یعنی "مجھے کمبل اوڑھاؤ!" انہوں نے اوڑھا دیا۔ اُسی وقت نزولِ وحی ہُوا، اور یہ آیات اُتریں، جنہوں نے آمدِ قرآن اور تلقینِ نبوّت کو اور بھی محکم و موثق بنا دیا:۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۗ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ (پ ۲۹: ع ۱۲)

ترجمہ:۔ "اے کملی اوڑھنے والے! ساری رات نماز میں کھڑا رہ، مگر تھوڑی رات (آرام کر)۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم (تہائی رات) یا اس سے (کچھ) زیادہ (دو تہائی رات) اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اچھی طرح پڑھا کر۔ کیونکہ ہم آگے چل کر تجھ پر ایک بھاری کلام

(قرآنِ مجید) اُتاریں گے"۔

اسی بنا پر مصرعِ دوم میں "جامِ آخریں" سے مراد قرآن حکیم ہے، جیسے نبی کریمؐ نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام روئے زمین کے انسانوں کے لئے لائے تھے۔ "آخریں" کا یہ مطلب ہے کہ قرآن سب سے آخری آسمانی کتاب ہے، اور ہر جہت سے جامع اور مکمل ہونے کے باعث تمام سابقہ کتابوں کی ناسخ ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:-

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط (پ ۶: ع ۴)

ترجمہ:- "آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا، اپنی (روحانی و اخلاقی) نعمتیں تم پر تمام کر دیں، اور تمہارے لئے (صرف) اسلام کو (سچا اور بہترین) دین قرار دے کر اُس پر تم سے رضا مند ہو گیا"۔

سُنایا ہند میں آ کر سرودِ ربّانی
پسند کی کبھی یونان کی سرزمیں میں نے

مصرعِ اوّل میں "سرودِ ربّانی" سُنانے والے سے مراد غالباً گورو نانک جی ہیں۔ اُن کی اصل تعلیمات کو آج بھی بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو وہ توحید و معرفت سے لبریز ہیں۔ خدمتِ خلق و احترامِ بنی آدم کا درس دیتی ہیں، اور اُن کے نام نہاد "چیلوں" کو صحیح معنوں میں مہذّب "انسان" بنا سکتی ہیں۔ اقبالؔ نے بانگِ درا میں "نانک" کے زیرِ عنوان جو کچھ کہا ہے، اُس کے آخری

دو اشعار قابلِ غور ہیں:-

بُت کدہ[1] پھر بعد مدّت کے مگر روشن ہُوا
نُورِ ابراہیمؑ سے آزر کا گھر روشن ہُوا
پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل[2] نے جگایا خواب سے

باقی رہا مصرع دوم، یعنی "پسند کی کبھی یونان کی سرزمیں نہیں لے"۔ تو یونانِ قدیم کے پیشِ نظر یہ حضرت ارسطو کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں۔ ارسطو یونان کا پہلا قدیم اشتمالی اشراقی حکیم ہے جس نے بُت پرستی کی مذمت کرتے ہوئے انسان کو عرفانِ نفس کی تعلیم دی اور خدائے واحد کی معرفت و پرستش کی طرف راغب کیا۔ اگر عہدِ عتیق سے قطعِ نظر عہدِ جدید ہی کو لیں، تو اصلاحی و انقلابی تحریروں کی بنا پر ہومر سے زیادہ اس منصب کا حقدار اور کون ہو سکتا ہے!

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سُنی
بسایا خطۂ جاپان و مُلکِ چیں میں نے

اس شعر میں گوتم بُدھ کی جانب اشارہ پایا جاتا ہے۔ اہلِ ہند نے بُدھ کے فلسفۂ زندگی کو قبول نہیں کیا تھا، لیکن جاپان اور چین نے اُسے سرآنکھوں پر جگہ دی، اور ایک معبود کا درجہ دے دیا۔ اُن ممالک میں گوتم بُدھ کی مورتیاں نہ صرف ہر گھر میں موجود ہیں، بلکہ چوراہوں پر بڑے بڑے

[1] مراد ہندوستان۔ [2] مراد گورونانک۔

عظیم الجثہ مجسمے بھی کھڑے کئے گئے ہیں۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ گوتم بُدھ کے عہد میں کسی قوم کا اُس کے فلسفے کو قبول کرنا اور کسی کا رَدّ کر دینا زیادہ تر وقت کے سیاسی ماحول، نفسیاتی رجحانات اور طبعی خصائص پر موقوف تھا۔ در اصل گوتم بُدھ کا فلسفہ اپنے اثر کے لحاظ سے سراپا قنوطیت (Pessimism) تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ رجائیت (Optimism) کے عناصر اُس میں مفقود ہیں۔ پس جو قومیں اپنی طبیعت، مزاج اور تصوّرات کے لحاظ سے اُس وقت افیونی، تن آسان اور مایوس و مضمحل ہوں گی اُنہوں نے گوتم بُدھ کی تعلیمات کو بآسانی قبول کر لیا، اور جنہوں نے محسوس کیا کہ یہ چیز سراسر رہبانیت ہے، گوشہ گیری ہے، قوت و سطوت کی نفی ہے، اور زندگی کے روشن و خوشگوار زاویوں سے گریز ہے، وہ اُس سے مجتنب رہے!

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں وہ قطرہ ہے کہ گوہر نہ ہوا تھا

بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے

اس شعر میں اٹھارھویں صدی عیسوی کے مشہور منجّم، ماہر ریاضیات اور سائنس داں نیوٹن (Isaac Newton) کے نظریۂ تخلیق و ترکیبِ عالم کی جانب اشارہ کیا گیا ہے

نیوٹن کی رائے میں دُنیا ذرّات کی باہمی ترکیب سے پیدا ہوئی ہے، تمام کائنات ایک معیّن شدہ ضبط و قانون کے تحت حرکت کر رہی ہے، خدا کو اس کائنات سے کوئی ربط و تعلق نہیں، اور معجزات صرف خیالی چیزیں ہیں۔ قدرت (Nature) نے کبھی کوئی واقعہ بصورتِ معجزہ ظاہر نہیں کیا۔

یہ نظریات چونکہ بائبل کی تعلیمات کے سخت خلاف تھے، اور ان سے مذہبی عقائد پر شدید ضرب پڑتی تھی، لہٰذا چرچ نے نہ صرف نیوٹن کی انتہائی مخالفت کی، بلکہ اُس کی تعلیمات کو بھی ایک مجنوں کی مہمل بڑ قرار دیا۔

لہُو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے

سائنس کی مختلف ایجادات و اختراعات کے معرضِ وجود میں آتے ہی یورپ میں دو قسم کے گروہ پیدا ہو گئے۔ پہلا گروہ سائنس دانوں کا، جو تمام اشیائے کائنات حتّٰی کہ مذہبی تعلیمات کو بھی خالص مادّی نقطۂ نظر سے عقل و شعور کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا تھا۔ دوسرا گروہ پادریوں اور مذہب کے پیروکاروں کا، جو دینی تعلیمات کو مادّی تنقید سے بالاتر رکھتے ہوئے صرف ایمان و یقین کو سرمایۂ حیات سمجھتا تھا، اس گروہ نے سائنس کو موجبِ کفر اور سائنس دانوں کو کافر گردانا، اور اس طرح پیروانِ عقل اور پیروانِ ایمان میں منافرت ہی نہیں، بلکہ انتہائی عداوت پیدا ہو گئی ہے، جس نے آخرکار معرکہ ہائے مذہب و سائنس کی صورت میں سینکڑوں زمینوں کو "لالہ زار" بنایا۔

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

اِس شعر میں بھی نیوٹن کے شغفِ نجوم کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ نیوٹن کا کہنا ہے کہ ستاروں کی حرکات و سکنات کائنات کے عمل پر بڑی حد تک اثر انداز ہیں۔

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں!
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

زمانۂ قدیم میں محققین کا عموماً یہ خیال تھا کہ سورج نہیں بلکہ زمین کائنات کا حقیقی مرکز و محور ہے آخرکار یونان کے ایک نامی سائنس دان ارس ٹارکس (Aristarchus) نے یہ نظریہ قائم کیا، کہ زمین نہیں بلکہ سورج کائنات کا حقیقی مرکز ہے اور زمین اُس کے گرد مثلِ پرکار گردش کرتی ہے اس شخص سے ایک ہزار سال بعد ایک اور سائنس دان اور ماہرِ ریاضیات کوپرنکس (Copernicus) پیدا ہُوا، جس نے ارس ٹارکس کے نظریہ کی پُر زور تائید و تصدیق کی اور گردشِ زمین کے مسئلہ کو ایک حقیقت قرار دیا۔ نیوٹن بھی اس نظریہ کا ایک سرگرم حامی ہے!

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقل دُوربیں میں نے

اِس شعر میں بھی نیوٹن کے قانونِ کشش (Law of Gravitation) کی جانب

اشارہ کیا گیا ہے۔ نیوٹن نے جب سیب کو درخت کی شاخ سے براہِ راست زمین پر گرتے دیکھا تو غور کرنے لگا کہ یہ زمین پر سیدھا کیوں گرتا ہے۔ اِدھر اُدھر فاصلے پر کیوں نہیں جا پڑتا۔ اسی بنا پر اُس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ زمین میں ایک خاص کشش ہے جو اشیا کو مقناطیسی طور پر اپنی طرف جذب کرتی ہے!

کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو
بنا دی غیرتِ جنّت یہ سرزمیں کس نے

اس شعر میں انیسویں صدی کے عظیم ترین اور کامیاب ترین سائنس دان تھامس ایڈیسن (Thomas Edison) کی ایجادات و اختراعات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ شعاؤں اور برقی لہروں کو ایڈیسن نے قید کیا تھا۔ اور آج بجلی کی گوناگوں مشینوں اور کارگاہوں نے رُوئے زمین کو جو غیرتِ جنّت بنا دیا ہے تو یہ ایڈیسن ہی کی شب و روز کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے:

جہاں تک محنت، صبر و استقلال اور اپنی ممکنات پر کامل یقین و اعتماد کا تعلق ہے موجدوں اور سائنس دانوں میں ایڈیسن کی مثال نہیں ملتی۔ یہ شخص مسلسل ۲۴ گھنٹے کام کرتا اور جب نیند کا غلبہ ہوتا تو اپنے معمل (Laboratary) میں میز پر پرانے اخبارات کا تکیہ بنا کے صرف پانچ سات منٹ کے لئے سو رہتا۔ ایڈیسن شادی کرنے پر ہرگز آمادہ نہ تھا، لیکن دوستوں نے زبردستی راغب کیا۔ عین اُس وقت جب دلہن عقد کے لئے تیار تھی اور باراتی دُلہا میاں کے بے چینی سے منتظر، ایڈیسن بالکل لاپتہ تھا۔ تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اپنے معمل کو اندر سے مقفل کئے ایک

سائنٹفک تجربہ کرنے میں سراپا محو و مستغرق ہے۔

اُس کا بہترین مقولہ یہ ہے کہ "راہِ عمل میں قدم اُٹھا کر مایوس و مضمحل ہونا انسان کی شان سے بہت گری ہوئی چیز ہے۔"

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا صہ ۸۲

یہ شعر نظم "ترانۂ ہندی" کے تحت واقع ہے۔ اقبالؔ اس شعر میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسلاف کے جذبۂ اصلاح اور شوقِ تبلیغِ حق کا تذکرہ کرتا ہے اگرچہ وہ بزرگ فقط عرب کی سرزمین پر قانع ہو کر بیٹھے نہیں رہے تھے، بلکہ روئے زمین کے ہر خطّے پہ اس وسعت سے پھیلنے کی کوشش کی کہ بقول مولانا حالیؔ "جو لنکا میں ڈیرا تو بربر میں گھر تھا" تاہم اُن کا سفر اور جذبۂ تسخیر جوع الارض کے لئے ہرگز نہ تھا، بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے وہ سراسر اعلائے کلمۃ الحق، استحکام حکومتِ الٰہیہ اور اذعانِ توحید کے لئے شب و روز دوڑے دوڑے پھرتے تھے، چنانچہ اسی سلسلے میں انہوں نے سرزمینِ ہند پر بھی قدم رکھا، اور گنگا کے میدانوں میں آکر ڈیرا ڈالتے رہے۔ محمود غزنوی کی فوجیں دیگر فتوحات کے علاوہ قنوج اور متھرا پہ بھی قابض ہوئیں۔ گویا ظہورِ اسلام کے بعد پہلے مجاہدینِ عرب نے ہندوستان کے ساحلوں پر قدم رکھا پھر محمود غزنوی اور محمد بن قاسم جیسے بزرگ تشریف لائے، اور پھر مغل بادشاہوں نے اپنے دورانِ سلطنت میں اس کے اہم ترین شہروں کو اپنا مرکز اور دارالخلافہ بنایا پس آبِ رودِ گنگا کو

انہیں حضرات کے ورودِ مسعود کی یاد تازہ کرائی گئی ہے، صرف گنگا ہی کی کیا تخصیص ہے۔ اقبال تو مسلمان کو تمام اقوامِ ایشیا کا نجات دہندہ، محسن، رہنما اور پاسبان قرار دے رہا ہے:۔

یہ نکتہ سرگزشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے!

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے ص۸۴

یہ شعر نظم "جگنو" میں سے ہے۔ اقبال نے یہاں مسئلہ وحدت الوجود کی جانب اشارہ کیا ہے، اسی عقیدے کو "ہمہ اوست" کا خطاب بھی دیا جاتا ہے۔ وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ ایک ذاتِ واحد ہونے کے باوجود کائنات کی ہر شے میں یوں جاری و ساری ہے کہ اُس کی وحدت بحیثیتِ مجموعی ایک ہی وجود بن کر رہ گئی ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ جملہ اشیائے عالم میں تقسیم ہونے کے باوجود واحد اور یکتا ہے۔ چنانچہ حضرت بایزید بسطامیؒ سے کسی مرید نے کہا کہ "جب کچھ بھی پیدا نہ ہوا تھا، تو فقط خدا تھا" اُنھوں نے فرمایا "اور اب کیا ہے؟ اب بھی تو صرف خدا ہی ہے۔"

پس اِن تاثرات کی روشنی میں مندرجہ بالا شعر کا مفہوم واضح ہے کہ کثرت میں وحدت کا راز مخفی ہے اور جو ہستی جگنو میں چمک بن گئی ہے، وہی ہستی پھول میں مہک ہے۔

اِس نظم میں ذیل کے اشعار مطلب کو اور بھی صاف کئے دیتے ہیں:۔

حُسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بُلبل، بُو پھول کی چہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شئے میں جبکہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

پس یہی وحدت، یہی خاموشیِ ازل، اور روح کائنات کا یہی معنوی رشتہ ہے، جس سے اشیاء کی "حقیقت" ایک ہی بن جاتی ہے، اور جس کے زیرِ اثر ذرّات کے دل سے بھی خورشید کا لہو ٹپکتا ہے:۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

لیجایتہ اِسی مفہوم کے تحت ذیل کا شعر بھی ارشاد فرمایا ہے:۔

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گُل سے قطرہ انسان کے لہو کا

ذیل کے تمام اشعار میں بھی مسئلہ وحدت الوجود کی جانب اشارہ پایا جاتا ہے:۔

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہِ سحر میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے صلے ۱۱

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا، چاند میں، سورج میں تارے میں
بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں افتادگی تیرے کنارے میں
جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

باقی رہا یہ سوال کہ وحدت الوجود یا "ہمہ اوست" کا عقیدہ از روئے شریعت صحیح بھی ہے یا نہیں، تو راقم الحروف قرآن حکیم ہی کے تاثرات کو بہترین سند قرار دیتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ محض تنقیدِ عقل سے قطع نظر ایمان و عرفان کی روشنی میں مندرجہ ذیل آیات کے مفہوم و مقصد پر غور فرمانے کے بعد کم از کم یہ حقیقت تسلیم کر لیجئے کہ اللہ تعالےٰ اور اُس کے لئے شوقِ حمد و ثنا کائنات کی ہر چیز میں موجود ہے :-

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ ؕ وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا

ترجمہ:- ساتوں آسمان، زمین، اور اُن کے درمیان جتنی بھی کائنات ہے، سب کے سب

يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ (پ ۱۵ : ۴ ع)

(ہمہ وقت) اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں۔ (فرش سے لیکر عرش تک) کوئی بھی شے ایسی نہیں جو اپنے خالق کی حمد و ثنا کا ورد نہ کرتی ہو۔ لیکن تم اُن کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔"

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۙ (پ ۱۸ : ۱۰ ع)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہو، طاق میں چراغ (روشن) ہو۔ چراغ ایک شیشے میں ہو۔ شیشہ (ایسا صاف ہے) گویا چمکتا ہُوا (موتی کی طرح) تارا ہے وہ چراغ ایک مبارک درخت زیتون (کے تیل) سے سلگایا جاتا ہے، جس کا رُخ نہ پورب کی طرف ہے (کہ شام کو اُس پر دھوپ نہ آئے) نہ پچھم کی طرف (کہ صبح کو اُس پر دھوپ نہ آئے)۔ اُس کا تیل (چونکہ بہت صاف ہے تو) قریب ہے کہ آگ چھوائے بغیر (آپ ہی آپ) سلگ پڑے۔ (غرض ایک نور نہیں بلکہ) نُورٌ علیٰ نُور ہے۔ اللہ جسے

چاہتا ہے اپنے نور کی جانب اُس کی رہنمائی کرتا
ہے۔ اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو سمجھانے کے لئے
مثالیں بیان کرتا ہے۔ اور اللہ تمام چیزوں کی
حقیقت و ماہیت کو جانتا ہے۔"

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یہ بند نظم "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" میں سے ہے۔ مصرعِ اوّل میں چشتی سے مراد حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جو "پیرِ سنجر" کے خطاب سے مشہور ہیں، اور جنہوں نے سالہا سال اس سرزمین میں توحید اور سُنّتِ رسول کی تبلیغ کی، اور روحانی فیوض کے وہ چشمے بہائے کہ ملّتِ اسلامیہ اُن سے اب تک سیراب ہو رہی ہے۔ مصرعِ دوم میں گورو نانک کی تعلیم و توحید کی طرف اشارہ ہے، جو اب تک اُن کے الفاظ میں محفوظ ہے۔ اگر نانک کے عقیدت مندوں نے اُس پر عمل نہیں کیا، تو اس میں تعلیمات کا کیا قصور۔ پھر مصرع سوم میں تاتاریوں سے مراد چنگیز خاں اور ہلاکو خاں ہیں، جن کی اولاد نے نتیجہ کار اسلام قبول کیا اور سلاطینِ مغلیہ کے نام سے صدیوں ہندوستان پر

حکمران رہے۔ اور اسے اپنا وطن بنایا۔ اُن کی چھوڑی ہوئی غیر فانی یادگاریں اُن کی شوکت و عظمت پر اب بھی شاہد ہیں۔ پھر چوتھے مصرع میں قرونِ اولیٰ کے مجاہدین کی طرف اشارہ ہے کہ ہندوستان کی کشش انہیں عرب سے کھینچ کر اس دُور دراز سرزمین پر لے آئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے عہد میں ہند اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات پیدا ہو گئے تھے، اور متعدد عرب سوداگر سندھ اور ملتان وغیرہ میں آ کر کاروبار کرنے لگے تھے۔ اسی طرح خلفائے بنو امیہ نے بھی سندھ اور ملتان تک اپنی سلطنت کو وسیع و عریض کر لیا تھا۔

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سُنی تھی دُنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

مصرع اوّل میں آسمانِ فارس سے ٹوٹے ہوئے ستارے وہ شعراء ہیں جن کی ایران میں چنداں قدردانی اور حوصلہ افزائی نہ ہوئی، لیکن جب وہ مغل سلاطین مثلاً اکبر اور جہانگیر وغیرہ کے دربار میں آئے تو اُن کے مذاقِ سخن اور شوقِ شعر و ادب نے انہیں گویا اوجِ کہکشاں پر روشن کر دیا۔ اُن میں بعض ممتاز و سرِ بر آوردہ شعراء طالب، کلیم، صائب اور عرفی وغیرہ ہیں، یہی وہ ستارے ہیں جو فارس کے آسمان سے بوجہ ناقدری ٹوٹے، اور پھر ہندوستان کے آسمان پر

سلاطینِ مغلیہ کے ہاتھوں چمکے!

تیسرے مصرعے میں فرماتے ہیں کہ:۔

"وحدت کی لے سُنی تھی دُنیا نے جس مکاں سے"

فی الواقع ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد آج تک جس قدر معتبر علمائے قرآن اور جس قدر راسخ العقیدہ موحّدین اس سرزمین نے پیدا کئے ہیں، وہ تمام کرّۂ ارض میں عالمِ اسلام نے مل کر بھی پیدا نہیں کئے۔ اُن بزرگوں نے توحید کے مفہوم اور مقتضیات کو نہ صرف خود با حسن طریق سمجھا، بلکہ انتہائی عداوت، جہالت، کورانہ تقلید، پابندیٔ رسم و رواج، اور گور پرستی کے باوجود پوری جرأت و بے باکی سے توحید و سُنّت کی تبلیغ و اشاعت کی، اُنہیں کافر و مرتد بھی کہا گیا، طرح طرح کی سنسنی خیز سزائیں بھی دی گئیں، اُن کے مشن میں پے در پے روڑے بھی اٹکائے گئے۔ حتّیٰ کہ قتل کی سازشیں بھی کی گئیں، لیکن اُن شیرانِ حق نے کسی مخالفت و عداوت کی پروا نہ کرتے ہوئے دُنیا کو وحدت کی لے اس انداز میں سُنائی کہ اُس کا نشہ آج تک اُتارے سے نہیں اُتر سکتا۔ آپ یہاں دریافت فرمائیں گے کہ اُن بزرگوں میں سے بعض کے اسمائے گرامی تو پیش کیا چاہئیں۔ جی ہاں، فہرست اسماء تو بہت طویل ہے، ذرا اختصار سے کام لیا جائے، تو بعض نہایت ممتاز بزرگ سید احمد بریلوی، حضرت شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی، حضرت مولانا نذیر حسین صاحب محدّث دہلوی، عارف باللہ حضرت مولوی عبداللہ الغزنوی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت علی ہجویری (عرف داتا گنج بخش) حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی، حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی،

اور شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی ہیں۔ حق یہ ہے کہ موحد اور مبلغ بزرگوں کا جیسا عظیم الشان مرکز دہلی رہا ہے، دنیا بھر میں اور کوئی نہیں رہا۔ بنابریں اقبال نے ایک اور نظم میں بھی یہ کہتے ہوئے کوئی مبالغہ نہیں کیا کہ جہاں آباد (دہلی) کے ذرّے ذرّے میں شمس و قمر خوابیدہ ہیں، اور اس خاک میں لاکھوں انمول گوہر مخفی ہیں۔ بلاشبہ یہ مکان توحید و ارشاد کا وہ بے نظیر ریڈیو سٹیشن رہ چکا ہے جس سے تمام دنیا نے توحید و عرفان کے ناقابلِ فراموش نغمے سُنے تھے:

"میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے"

صحاحِ ستّہ میں کوئی ایسی مستند حدیث نہیں جس میں نبی کریمؐ کے ایسے الفاظ موجود ہوں جن سے من جانبِ ہند ٹھنڈی ہوا آنے کا تذکرہ پایا جائے۔ ہاں ایک حدیث میں یمن سے ٹھنڈی ہوا آنے کا ذکر موجود ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے آغازِ شاعری کی اس نظم میں محض کوئی سنی سنائی روایت لے کر یہ مضمون باندھ دیا ہوگا۔ بہرکیف جس سرزمین نے کفرستان ہونے کے باوجود بے شمار اور فقید المثال عاشقانِ توحید و سنّت اور مبلّغینِ قرآن پیدا کئے ہوں، وہاں سے ایک چھوڑ کئی مرتبہ ٹھنڈی ہوا، میرِ عربؐ کے جسمِ اطہر تک پہنچی ہو تو اس میں حیرت و انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبیؑ کا آکر ٹھہرا جہاں سفینہ

ظاہر ہے کہ مصرعِ اوّل تحریر کرتے وقت اقبال پر حبِّ وطن (اور یہ حبِّ وطن محض ابتدائی

تصوّر کا جذبہ ہے، کا نشہ اس قدر طاری تھا کہ حفظِ مراتب اور احتیاطِ شرعی کی حدود کو پھاند کر مبالغہ بلکہ اغراق کی حد تک جا پہنچے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو منصب اور جو خصوصیات ہر جلیل القدر پیغمبر کو عطا فرمائیں، وہ اُسی پر ختم ہو چکیں، اور کسی دوسرے شخص کو نہ وہ مقام حاصل ہُوا، اور نہ ہو سکتا ہے۔ بایں ہمہ معمولی اور خطا و عصیاں کے پُتلے انسانوں کو کلیم کا خطاب دینا کیونکر روا ہو سکتا ہے؟ اور اسی طرح جو تقدس، جو روحانی فوقیت اور جو روحانی عظمت کوہِ طور کو حاصل ہے، وہ ہندوستان کے معمولی پہاڑوں کو کہاں نصیب؟ بہرکیف ہر مصنف کے لئے احتیاطِ شرعی اور حفظِ مراتب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تحریر میں کسی شے کی مدح و ذم بیان کرتے وقت محض جذبات سے مغلوب نہ ہو۔ اور مبالغہ سے ہر رنگ میں گریز کرے۔

نوح نبیؑ کا آ کر ٹھہرا جہاں سفینہ

اوراقِ تاریخ یا تفسیرِ قرآن میں اس چیز کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ حضرت نوحؑ کا سفینہ طوفان کے بعد ہندوستان کے کسی خطے پر اُترا تھا۔ ہاں یہ کئی جگہ مذکور ہے کہ سفینۂ نوحؑ جودی پہاڑ پہ ٹھہرا تھا جو واقع ہے:

باقی رہا طوفانِ نوحؑ اور اس کی وجوہات، تو اس کا مجمل سا خاکہ [illegible] ہے کہ حضرت نوحؑ مسلسل نو سو برس تبلیغِ حق کرتے کرتے مایوس ہو گئے، اور معدودے چند اشخاص [illegible] قوم نے [illegible] کے ان کی تضحیک کی، اور احکامِ الٰہی سے بغاوت و سرکشی اختیار کی۔ تو حضرت نوحؑ نے بارگاہِ الٰہی میں بددعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور کہا [illegible] کہ ان

فاسق و فاجر لوگوں کے تخم بھی ناپاک ہو چکے ہیں۔ اور اُن سے کافر و بدکار نسلوں کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا پس میری التجا ہے کہ اپنے قہر کو استعمال میں لا، اور رُوئے زمین پر ایک متنفس بھی زندہ نہ رہنے دے!

خدائے قہّار نے یہ بددعا قبول کی، اور حضرت نوحؑ کو حکم ہوا، کہ وہ ایک بڑا سفینہ تیار کریں، اور اس میں ہر ایک چیز کا جوڑا جوڑا رکھ لیں، تاکہ مسخ شدہ انسانوں کے ساتھ ہی ساتھ چوپایوں اور پرندوں کی نسل بھی ختم نہ ہو جائے، حضرت نوحؑ نے اس حکم کی تعمیل میں بیڑا بنانا شروع کیا، کفّار نے یہ دیکھ کر مضحکہ اڑایا، اور آنے والے عذاب پر یقین نہ کیا۔ پسرِ نوح بھی انہیں کفّار میں شامل تھا، باپ نے شفقت سے سمجھایا، مگر بیٹے نے ایک نہ مانی، آخر طوفان آیا، آسمان نے اپنا ذخیرہ آب چھوڑ دیا، اور زمین نے اپنے چشمے اُگل دیئے۔ کفار نے طوفان سے بچنے کیلئے پہاڑ کی چوٹی پر پناہ لی، مگر پانی وہاں بھی جا پہنچا، اور نتیجہ کار سب کو چیونٹیوں کی طرح عالمِ بے بسی میں غرق ہونا پڑا، اس موقع پر ڈوبتے ہوئے بیٹے نے باپ سے امداد طلب کی، باپ کا دل بھر آیا، اور قادرِ مطلق سے سفارش کی۔ جواب ملا کہ "وہ تیرا بیٹا ہی نہیں، کیونکہ اُس کے اعمال صالح نہیں ہیں"۔ چنانچہ بیٹا بھی ہائے وائے کرتا ہوا غرقِ آب ہوا۔ اور کافر ہونے کی وجہ سے ایک پیغمبر باپ کی سفارش بھی اُس کے حق میں سراسر بے سود رہی۔ یہ دلیل ہے اس امر کی کہ عاقبت میں صرف ذاتی اعمال ہی باعثِ نجات ہوں گے۔ قرآنی الفاظ تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ طوفانِ نوح عالمگیر ہوگا، کیونکہ بددعا میں "علی الارض" (تمام زمین پر) کے الفاظ موجود ہیں، اور ان سے ثابت

ہے کہ طوفان زمین کے ہر خطّے پر حاوی ہوگا:-

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (پ ۲۹ ع ۹) "اے پروردگار! روئے زمین پر کفار میں سے ایک باشندہ بھی سلامت نہ رہنے دے"

کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ! ص۱۰

یعنی اگر تجھے قدرت نے نورِ بصیرت عطا کیا تو دنیا کی ہر شے میں عظمتِ خالق اور معرفت الٰہی کا جلوہ دیکھ۔ "نقشِ کفِ پائے یار" سے مراد ہیں خالق کے گوناگوں تاثرات۔ شعر کے دوسرے مصرع میں درحقیقت اشارہ ہے اس آیۂ شریفہ کی جانب کہ:۔ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (پ ۱ ع ۱۳) یعنی :- "جس طرف بھی تم رُخ کرو، اللہ تعالےٰ کے چہرۂ جمیل کو موجود پاؤ گے"!

منصور کو ہُوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی ص۱۰۵

یہ اشارہ ہے منصور کے نعرۂ "انا الحق" کی طرف "میں ہی خدا ہوں" ایک ایسا دعویٰ تھا جو منصور کے ہمعصر مفتیوں، مُلّاؤں اور اماموں کو صریحاً کفر معلوم ہُوا، اور اُنہوں نے بالاتفاق کُفر کا فتویٰ صادر کیا۔ خلیفہ مقتدر باللہ کا عہد تھا۔ اُس نے فوراً فتویٰ کی تعمیل کرائی، اور منصور کو سُولی پر چڑھا دیا گیا۔ "تذکرۃ الاولیاء" میں لکھا ہے کہ پھانسی پانے کی تاریخ سے پیشتر کچھ عرصہ منصور

کو قید میں رہنا پڑا۔ لیکن وہ بار بار مقفّل کوٹھڑی میں سے بھی غائب ہو جاتے رہے۔ اس کیفیت پر پہرہ دار نہایت متعجب تھے۔ اور انہوں نے کوتوال شہر کو خبر بھی کی۔ آپ سے اس پُراسرار واقعہ کی تحقیق کی گئی تو جواباً فرمایا کہ "میرا جسدِ خاکی فقط تمہارے دیکھنے کی چیز ہے، ورنہ حقیقتاً میں سراپا روح ہو چکا ہوں، اور روح کو قید خانے کی سلاخوں میں سے نکلنے کے لئے کوئی دِقّت پیش نہیں آ سکتی۔ میں اپنی روحانی سیر سے فارغ ہو کر اس کوٹھڑی میں دوبارہ اِس لئے آجاتا ہوں کہ تمہیں مجھ پر بُزدِل ہونے کا گمان نہ ہو اور تم کہنے لگو کہ سزائے موت کے خوف سے "انا الحق" کہنے والا منصور روپوش ہو گیا۔"

بہرکیف جب منصور کو پھانسی کے قریب لایا گیا تو مریدوں نے عرض کیا کہ حضور، ان بے عقل ظالموں کے لئے بددعا تو کرنے چاہیئے کہ یہ احترام کی بجائے آپ کے ساتھ ایسا بُرا سلوک کر رہے ہیں۔" جواباً فرمایا "یہ لوگ پکے موحد ہیں، شرک کے دشمن ہیں، اور اپنے جذبہ توحید کے تقاضے سے مجھے اُن الفاظ کی سزا دے رہے ہیں جنہیں یہ ایک فتنۂ شرک سمجھتے ہیں پس شرعی حیثیت سے یہ اپنا ایک نہایت اہم فریضۂ اسلام ادا کر رہے ہیں۔ پھر میں ایسے نیک نیت موحّدین کے لئے بددعا کیوں کروں؟ اپنی عقل کے مطابق جو کچھ انہوں نے سمجھا ہے وہ عمل میں لائیں، اور اپنے جذبۂ باطن کے تحت جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے، میں برملا کہہ رہا ہوں۔ میں تو ان کے جذبات کو خوب سمجھتا ہوں، لیکن وہ مجھے نہیں سمجھ سکتے۔"

مروی ہے کہ سولی سے پیشتر جب منصور کے دونوں بازو کہنیوں سے کاٹے گئے، اور خون زمین

پر گرا تو ہر قطرے سے زمین پر "انا الحق" کے الفاظ بننے لگے۔ منصور نے اپنے دونوں ٹنڈ چہرے پر مل لئے اور وہ سرخ ہو گیا۔ حاضرین نے پوچھا یہ کیا؟ فرمایا کہ خون بکثرت بہنے سے چہرہ زرد ہو جاتا ہے، اور میں اسے سرخ اس لئے کرتا ہوں کہ سزا دینے والے میری زردی رخ کو خوف پر محمول نہ کریں۔

منصور نے سولی پانے سے پیشتر اپنے گریہ کناں عقیدت مندوں کو اپنا لبادہ دیتے ہوئے کہا کہ آج سے تیسرے روز دریائے دجلہ میں ایک ایسا طوفان اٹھے گا جو شہر بغداد کو آناً فاناً بہالے جائے گا۔ طوفان ساحل سے اٹھنے لگے تو فوراً اس پر میرا لبادہ مارنا۔ اس فعل سے طوفان آپ ہی رک جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ بغداد اور اہل بغداد برباد ہوں۔ چنانچہ حسب الحکم سولی چڑھانے کے بعد منصور کی لاش جلائی گئی اور اس کی راکھ دجلہ میں پھینک دی گئی۔ دجلہ میں تیسرے روز سچ مچ ایک خوفناک طوفان برپا ہوا، جو لبادہ مارنے ہی سے فرو ہوا۔

حق تو یہ ہے کہ عارف باللہ ہستیاں عبادت اور ذکر و دعا کی برکت سے نتیجہ کار ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہیں، جو عوام کی سطح سے بہت بلند ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ عقل کے معمولی زاویوں سے اس کی عظمت و صداقت کا اندازہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ چنانچہ منصور نے بھی ایک ایسا مقام حاصل کر لیا تھا جسے شبلی اور سرمد شہید جیسے ہمراز ہی سمجھیں تو سمجھیں، غیروں کو کچھ سمجھائی نہیں دیتا۔ اس موضوع پر حضرت گرامی نے ایک شعر کہا ہے کہ اسے پڑھ کر علامہ اقبال بھی بار ہا وجد کیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ کس قدر سادہ مثال سے کتنے پیچیدہ مسئلے کو تسلی بخش طور پر

حل کر دیا ہے۔ وھو ہذا:۔

انا الحق گفتنِ منصور تاویلے نمی خواہد
گدا گم می کند خود را چو دولت می کند پیدا

توجیہہ: منصور کا انا الحق کہنا کسی تاویل کا متقاضی نہیں۔ ایک گدا ہے نوا جب یکایک کہیں سے دولت پا لے، تو بیخود ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے، اور یہی کیفیت منصور کی تھی۔

محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں ص۱۰۱

غالباً یہ اشارہ ہے اُس واقعہ کی طرف جبکہ حضرت موسیٰ نے کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ "اَیْنَ اَجِدُكَ رَبِّ؟" یعنی "اے پروردگار! اگر تو ہستی ہے تو مجھے کہاں ملے گا؟" جواب ملا۔ "عِنْدَ الْمُنْکَسِرَۃِ الْقُلُوْبِ" یعنی "شکستہ دل لوگوں میں!"

اور یوں بھی نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ خدا سے ملنا چاہو تو اُسے غریبوں اور شکستہ دل لوگوں میں ڈھونڈو! علاوہ ازیں ایک دعا میں ارشاد فرمایا۔ "الٰہی! مجھے غریبوں میں زندہ رکھ، غریبوں میں وفات دے، اور روزِ حشر غریبوں ہی میں اُٹھا!"

اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ امراء عموماً نشۂ دولت اور حُبِّ جاہ میں اس قدر غرق و بےحس ہو جاتے ہیں کہ انہیں خدا کی محبت یا عبادت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ قرآن مجید نے

انبیاء کا یہ خاصہ طبعی باین الفاظ بیان فرمایا:۔ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (پ ۳۰ ع ۲) یعنی "انسان جب خود کو امیر اور دولت وجاہ کے لحاظ سے مستغنی پاتا ہے تو یقیناً آمادۂ سرکشی ہو جاتا ہے۔"

پس کسی کا قلب اگر "شکستہ" اور گداز ہو سکتا ہے، اور اس میں حُبِ الٰہی کا امکان ہے، تو وہ فقط غربا کا دل ہے، جسے سنگِ حوادث کا ہر وقت سامنا رہتا ہے۔ اقبال نے مصرع اول میں محبت کو مے سے اور قلبِ شکستہ یا قلبِ گداز کو نازک آبگینے سے تشبیہ دی ہے۔ دل شکستہ پر "بانگِ درا" میں دو اور شعر ہیں۔ اُن میں سے پہلا شعر ہے:۔

مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا
کہ ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے ص ۱۱

یعنی دل سے حقیقت اور معرفت کے نغمے اس کے شکستہ ہونے پر پیدا ہوتے ہیں مصائب و حوادث انسانی فطرت کے رازہائے سربستہ کو منکشف کرتے ہیں، اور ذاتِ حق سے رشتہ محبت و مودت مستحکم کرنے میں ممد و معاون ہیں۔ چنانچہ ایک اور نظم میں فرمایا:۔

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال

اسی طرح "قلبِ شکستہ" کے موضوع پر ایک اور شعر ہے :-

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اس شعر میں "آئینہ" سے مراد "آئینۂ دل" ہے۔ اسی طرح "آئینہ ساز" سے مراد اللہ تعالےٰ ہے۔ فرماتے ہیں کہ دل کو غموم و ہموم اور حوادثِ روزگار سے اس قدر بچا کر مت رکھ کہ دنیا میں تجھے دکھ درد کا احساس تک نہ ہو۔ آخر یہ بہشت تو ہے نہیں کہ جہاں کسی قسم کا آزار ہی نہ ہو۔ یہ دنیا ہے اور دنیا میں حوادث و خطرات کا سہنا اور مقابلہ کرنا فطرتِ انسانی کا کمال ہے۔ پس تیرا آئینۂ دل شکستہ بھی ہوا تو آئینہ ساز کی نگاہ میں اس کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔

سختیاں کرتا ہوں دل پر غیر سے غافل ہوں میں
ہائے کیا اچھی کہی، ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں ص ۱۱۱

اس شعر کے مصرعِ دوم میں مندرجہ ذیل آیۂ قرآنی کی جانب اشارہ پایا جاتا ہے :-

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ط إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (پ ۲۲: ع ۵)

ترجمہ :- ہم نے اپنی امانت (احکامِ الٰہی) آسمان زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی، مگر انہوں نے یہ بوجھ (تکلیفِ شرعی) اُٹھانے سے انکار کر دیا، اور اس کی (ذمہ داریوں) سے ڈر گئے۔ آخر انسان نے یہ بوجھ اُٹھا لیا۔ در آنحالیکہ وہ

اس کی تعمیل میں ظالم اور جاہل ہے۔"

اس بنا پر شعر کا مطلب یہ ہوا کہ میں صحیفۂ آسمانی اور قانونِ الٰہی کی رہنمائی اور ہدایت و سعادت حاصل کرنے کے باوجود غیر مسلموں کی شرارت و سازش سے غافل ہوں، اور ان کی گمراہ کن چالوں سے دلِ معصوم پر پیہم سختیاں سہہ رہا ہوں۔ لہٰذا:۔ ع

ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں

"ظالم" ہر اس شخص کو کہا جائے گا جو راہِ اعتدال کو چھوڑے، دستورِ شرعی سے بغاوت کرے، اور بنا بریں اپنی ذات یا قوم کے لئے تباہی و بربادی کا سامان پیدا کرے، اسی طرح "جاہل" گو عام طور پر ایک اَن پڑھ شخص کو کہا جاتا ہے، تاہم قرآنی اصطلاح میں ہر وہ شخص جاہل مطلق ہے جو علم حاصل کرکے اس پر عامل نہ ہو، بلکہ قرآن تو ایسے عالم بے عمل لوگوں کو اُس گدھے سے تشبیہ دیتا ہے، جس پر کتابوں کا بوجھ لاد دیا جائے۔

ہے مری ذلّت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل
جس کی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں ص۱۱۱

"جس کی غفلت کو ملک روتے ہیں" یعنی جس کی غفلت پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں روزِ ازل جب اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کے سامنے یہ الفاظ کہے کہ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً یعنی "میں روئے زمین پر اپنا ایک خلیفہ (نائب) پیدا کرنے والا ہوں"، تو انہوں نے بطورِ اعتراض کہا:۔ اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ

وَ نُقَدِّسُ لَكَ ط یعنی: "کیا تو زمین میں ایک ایسی نوع کو پیدا کرنے لگا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے، حالانکہ اگر مقصد عبادت ہی ہے تو ہم تیری تعریف و توصیف کے ساتھ تیری عظمت و کبریائی بیان کرتے ہیں۔"

اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا:۔ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ "آدم کی عظمت و فضیلت کے متعلق جو کچھ میں جانتا ہوں، تم نہیں جانتے۔"

اور اس کے بعد:۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۔ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۔ (پ: ۱ ع ۴)

ترجمہ:۔ "پھر اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اشیائے کائنات کے نام سکھا دیئے، اور انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر تم اپنی فضیلت و بزرگی میں صادق ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ انہوں نے عرض کیا تو پاک ہے۔ ہم کیا جانیں۔ ہمیں تو فقط اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہم کو سکھایا بیشک تو ہی بڑے علم و حکمت والا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ "اے آدم اب تو فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا" پس جب آدم نے وہ تمام نام بتا دیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں

سے کہا: "کیوں! میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں
آسمان و زمین کی غائب چیزوں کو جانتا ہوں، اور
تمہاری ہر ظاہر اور پوشیدہ بات سے بھی
واقف ہوں"۔

بہرکیف معاً فرشتوں کو حکمِ خداوندی سے آدم کے حضور سجدہ کرنا پڑا، اُس کی عظمت و فوقیت کے قائل ہوئے، اور جس ہستی کی غفلت و لاعلمی پر وہ معترض تھے، اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

پس حلِ تلمیحات کے بعد یہی تعبیر ہے اس شعر کی:-

ہے مری ذلّت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل
جس کی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں

میں پیشتر ازیں عرض کر چکا ہوں کہ یہاں "روتے ہیں" بمعنی "رشک کرتے ہیں" مستعمل ہوا ہے
چنانچہ ایک اور شعر سے "رشک" کا یہی قرینہ ثابت ہے:-

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

"نوریانِ آسماں پرواز" سے مراد ہیں فرشتے۔ "یہ خاکی" یعنی انسان ہے۔

واعظ! کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
ص ۱۱۴ دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے ص ۱۱۲

ان اشعار میں صوفیاء کے اصول "فنا فی التوحید" کی جانب اشارہ پایا جاتا ہے، جو اخلاص اور محبتِ الٰہی کا انتہائی مقام ہے۔

عوام الناس جو بھی اور جیسی بھی عبادت کرتے ہیں، یا صدقہ و خیرات میں حصہ لیتے ہیں تو اُس کا محرک زیادہ تر یہ تصوّر ہوتا ہے کہ عقبیٰ میں ہمیں دوزخ کے عذاب سے نجات حاصل ہوگی، اور جنّت الفردوس کے دروازے ہمارے لئے باز کر دیئے جائیں گے۔ اور پھر جنّت میں راحت و آرام اور عیش و عشرت کا ضروری سامان مثلاً شرابِ طہور، دودھ اور شہد کی نہریں، موتیوں کے خیمے، حوریں، غلمان، فواکہات اور ریشمی لباس بافراط موجود ہوں گے۔ اس میں ذرّہ برابر شبہ نہیں کہ حسبِ آیاتِ قرآنی و احادیث صحیحہ اللہ تعالیٰ یہ تمام نعمتیں مومن اور پرہیزگار لوگوں کو روزِ حشر عطا فرمائے گا، لیکن عبادت و عرفان میں پختہ کار لوگ ان لوگوں کے تصور ہی کو شرک (شرکِ خفی) قرار دیتے ہیں۔ اور اُن کی محکم دلیل یہ ہے کہ: اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوَاهُ (قرآن حکیم) یعنی "کیا آپ نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جو اپنی خواہشاتِ نفسانی ہی کو معبود بنائے ہوئے ہے"؟

پس صحیح معنوں میں موحّد اور عارف باللہ لوگ اپنے ذکر و عبادت کا مقصودِ حقیقی جنّت یا قبیرا کو ہرگز نہیں بناتے بلکہ اُن کا نصب العین ہمیشہ رضائے الٰہی اور فقط رضائے الٰہی ہے، چنانچہ مومن نے اسی بنا پر کہا ہے کہ:-

۱۶۷۱۴

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں، کرم کی تیرے خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے، نہ میں مشتاق جنت کا!

اور غالب جیسا رند شاعر بھی کہتا ہے:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

بہرحال خالصاً خدا کی "رضا" سے غافل ہو کر "جزا" کی تمنا کو اقبال "سوداگری" قرار دیتا ہے جو اصولِ توحید اور جذبۂ اخلاص کی رو سے سراسر حرام و ناجائز ہے!

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لَا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلَّا اللہ کا صـ ۱۱۸

اس شعر میں صوفیاء کے اس مشہور عقیدے کی طرف اشارہ ہے کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ یعنی، "اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی شے موجود نہیں"۔ مراد یہ کہ وجودِ حقیقی صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے ہے، باقی سب عقل و نظر کا دھوکا ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ ہستی اشیائے عالم کی نفی ایک دلِ آگاہ کا کرشمہ ہے اور جب تک انسان اس "لَا" (نفی) کا قائل نہ ہو تب تک "اِلَّا اللہ" (اثباتِ ہستی باری تعالیٰ) ایک امرِ محال ہے!

سن اے طلبگارِ دردِ پہلو میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا صـ ۱۲۷

یہ شعر نظم "پیامِ عشق" کے تحت واقع ہوا ہے، یہ اشارہ ہے اُس واقعہ کی جانب جبکہ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ آور ہو کر سومنات کے مندر میں تمام بتوں اور "دیوتاؤں" کو پاش پاش کر دیا تھا۔ مخالفین اسلام تو اپنے تعصب و عناد کے تحت اُسے بندۂ ہوس، غلامِ زر اور بت فروش، وغیرہ کہتے چلے آئے ہیں، لیکن انصاف پسند لوگوں سے مخفی نہیں کہ اُس کا یہ فعل سراسر اسبابِ شرک کی بیخ کنی، حفظِ توحید اور تبلیغِ حق کے لئے تھا۔ اُس نے "مخلوق خداوندوں" کے پیکر اسلئے توڑے کہ دلوں میں فقط "خالق" کی عظمت و وحدانیت کا سکّہ بٹھایا جاسکے۔ بہرکیف مندرجہ بالا شعر میں عشق، طلب گار درد پہلو یعنی عاشقانِ حق سے خطاب کرتا ہے کہ اگر سینے میں عشق کو صحیح طور پر زندہ کرنا منظور ہے تو سومنات دل کو میرے حملوں کے لئے کھول دے تاکہ میں قصرِ ہوا و ہوس کو ریزہ ریزہ کر کے جذبۂ توحید کو مستحکم کرسکوں۔ پس دل کو ایک مرکز پر لانے کے لئے عشق کے حضور سراپا ایاز یعنی غلام و نیاز مند ہونا لازمی ہے!

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے

مَیں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

مطلب یہ کہ فقط عبادت کی دُھن گوشہ گیری اختیار کرنے والے، اور دشت و جبل کو اپنا بسیرا بنانے والے عابد و زاہد لوگ تو لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ لیکن انسانیت کو ضرورت صرف اُن افراد کی ہے جو سوسائٹی کا ایک مفید اور کارآمد عضو ہوں، قوم و وطن کی خدمت کر سکیں اور خدا کے کمزور و محتاج بندوں سے عملی طور پر محبّت کریں۔ اس شعر سے علامہ مرحوم کا مقصدِ حقیقی "رہبانیت"

کی تردید ہے، اور لازماً اشارہ ہے اس ارشادِ نبوی کی جانب کہ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔
یعنی "اسلام میں رہبانیت اور گوشہ گیری مطلق حرام ہے۔"

صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے ص ۱۵۶

یہ شعر نظم "بلادِ اسلامیہ" میں سے ہے۔ "یہ سرزمیں" سے مراد قسطنطنیہ ہے۔ "لولاک"
میں اشارہ ہے اس حدیثِ قدسی کی طرف لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ یعنی "اے
نبی! اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا تو آسمان بھی پیدا نہ کرتا۔"

نکہتِ گُل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا
اے مسلماں! ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر ص ۱۵۶
سینکڑوں صدیوں کے کشت و خون کا حاصل ہے یہ شہر

"یہ شہر" یعنی قسطنطنیہ۔ یہ شہر بہت پرانا ہے اور اسلامی عظمت و شوکت اور جاہ و جلال کا
گہوارہ رہ چکا ہے۔ امیر معاویہ کے زمانے میں مجاہدینِ اسلام نے اس پر پہلی مرتبہ حملہ کیا تھا، اور
بعد ازاں اکثر اوقات اسلامی افواج کا مرجع و مسکن رہا۔ عثمانی ترکوں نے بھی اس پر یلغار کی اور
آخرکار سلطان محمد دوم نے نہایت محنت و کاوش سے اس کو تسخیر کیا۔ حضرت ایوب انصاری جیسے
خوش نصیب صحابی کا مزارِ پُر انوار بھی اسی شہر میں ہے، جو امیر معاویہ کے عہد میں کفار سے جنگ کرتے

کرتے شہید ہوئے تھے۔ ان حضرات کی فضیلت کا ایک خاص مقدس سبب یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے جب مکّہ سے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی تو انصار میں سے ہر شخص مصر تھا کہ حضورؐ اس کے مکان کو شرفِ سکونت بخشیں۔ آخر کار نزاع کو مٹانے کے لئے فیصلہ یہ ہوا کہ آنحضرتؐ کی اونٹنی جس شخص کے گھر کے سامنے خود بخود بیٹھ جائے، آنحضرتؐ اسی کے یہاں قیام فرمائیں۔ چنانچہ یہ سعادت حضرت ایوبؓ انصاری کو نصیب ہوئی۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

چمکنے والے مسافر عجیب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

یہ اشعار نظم "ستارہ" میں سے ہیں۔ "دنیا کی بستی" میں ایک کا اوج دوسرے کی پستی ہے۔ بطورِ مثال سورج ہی کو دیکھو کہ اس کے ظہور سے لاکھوں ستاروں کو نیست و نابود ہونا پڑتا ہے ان تاثرات سے اقبال فلسفے کے اس ہنگامہ خیز موضوع کی جانب اشارہ کر رہا ہے جسے بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کہا جاتا ہے، اور جسے ....

کئی جگہ مختلف انداز میں بیان کر چکا ہے مثلاً معرّی اپنے دسترخوان پر بھُنا ہوا تیتر دیکھتا ہے تو کہتا ہے:-

اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تُو
تیرا وہ گناہ کیا ہے، یہ ہے جس کی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تُو
دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات (بالِ جبریل)

پس چونکہ ہستی میں غلبہ، اقتدار اور فتح و نصرت صرف صاحبِ قوت لوگوں کے لئے ہے اور ضعیفی ایک ایسا جرم ہے جس کا نتیجہ ہر نوع مخلوق کو موت کی صورت میں دیکھنا پڑتا ہے خزیدگی اور استحکام کی اسی ضرورت کے تحت اقبال کو ایک اور جگہ بھی کہنا پڑا کہ:-

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

اقبال کا منبعِ فیض چونکہ رومی ہے، لہٰذا وہ بھی "بقائے اصلح" کے اس قانون کی جانب اشارہ کرتا ہے:-

جملہ عالم آکل و ماکول داں!

یعنی "دنیا ہے کیا؟ اس میں کچھ چیزیں کھاتی ہیں، اور کچھ چیزیں کھائی جاتی ہیں"
یا بالفاظِ دیگر دنیا میں کچھ ہستیاں فنا کرتی ہیں اور کچھ فنا کی جاتی ہیں۔ بس یہی غایت ہے اس فلسفے کی کہ:-

جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے!

حاصلِ بحث، بہرکیف یہ ہے کہ اگر ایک باوقار اور خود مختار زندگی مقصود ہے تو پستی سے نکل کر اوج حاصل کرو، اور کمزوری کے اسباب ترک کر کے قوت و سطوت حاصل کرو، کیونکہ ضعیفی قدرت کی نظر میں بھی بدترین جرم ہے!

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں ص ۱۵۸

یعنی دنیائے فانی میں بقا کسی شے کو نصیب نہیں، اور اگر اس عالمِ کون و فساد میں کوئی چیز بالاستقلال باقی ہے تو وہ تغیر و انقلاب ہے۔ اقبال نے نہایت حسین و جمیل پیرائے میں ثابت کیا ہے کہ اگر بقا کسی چیز کو حاصل ہے تو وہ خود قانونِ فنا ہے۔ اور اس طرح فنا کی ہیبت میں وہ چند اضافہ کر دیا ہے پس تغیر چونکہ سراسر رفتارِ وقت اور مرورِ ایام سے ظہور میں آتا ہے لہٰذا صریحاً اشارہ ہوا قرآنِ حکیم کے اس مضمون کی جانب کہ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (پ ۴: ع ۴) یعنی "ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں" حقیقتاً ایام کے ہیر پھیر سے حوادث پیدا ہوتے ہیں، اور حوادث ہی تغیر و انقلاب کا اصل باعث ہیں۔

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہگذر
چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور ص ۱۶۴

یہ شعر نظم "گورستانِ شاہی" میں سے ہے۔ مصرعِ اوّل کا مفہوم یہ ہے کہ دُنیا کی سرائے فانی میں ہزاروں "قافلے" آکر ٹھہرے، اور پھر عدم آباد کو چل دیئے۔ مصرعِ دوم میں "کوہِ نور" دُنیا کے اُس سب سے بڑے اور قیمتی ہیرے کا نام ہے جو مختلف ادوار زمانہ میں مختلف بادشاہوں کے ہاتھوں منتقل ہوتا رہا، جس کی آنکھوں نے بیسیوں تاجور دیکھے، اور پھر آج بھی جارج ششم کے تاج میں آویزاں ہے!

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے "اَلَم" کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی ص ۱۶۵

یہ شعر نظم "فلسفۂ غم" میں سے ہے۔ مقصد شعر کا یہ ہے کہ انسانی زندگی چونکہ ہر جہت سے دو متضاد کیفیات کی حامل ہے، اور اس میں خیر و شر، حق و باطل، قبض و بسط، اور راحت و مصیبت پہلو بہ پہلو چلتے ہیں، لہٰذا مسرت کے ساتھ ہی ساتھ غم بھی اس کا لازمی جزو ہے۔ اور اس بنا پر لفظ "اَلَم" سے ایک بلیغ اشارہ کیا اس سورۂ قرآنی کی جانب:-

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا	ترجمہ:- "اے پیغمبر! کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھولا!
عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ	اور ہم نے تیرا بوجھ تجھ سے اُتار دیا، وہ بوجھ
ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝	جس نے تیری پیٹھ توڑ رکھی تھی۔ اور ہم نے

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ (پ۳۰: ع۱۹)

تیرا نام (ہر دو جہان میں) بلند کر دیا۔ (پس تو گھبراتا کیوں ہے) ہر تنگی کے ساتھ آسانی لگی ہوئی ہے، بیشک تنگی کے ساتھ آسانی لگی ہوئی ہے۔ پھر حبیب تجھ کو (دنیا کے کاموں سے) فراغت ہو تو (ذکر و عبادت میں) محنت کر، اور اپنے مالک کی طرف دل لگا!"

اس سورت میں "عُسر" (یعنی تکلیف و غم) کا تذکرہ مذکورہ بالا شعر کی تلمیح کا مرجع ہے!

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

یہ شعر نظم "ترانۂ ملّی" میں سے ہے۔ مسلمان مجاہدین اعلائے کلمۃ الحق کے لئے نہ صرف سرزمینِ مشرق پر چھا گئے بلکہ حسبِ تلقین آیۂ شریفہ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (اللہ کا حکم مشرق و مغرب میں یکساں طور پر جاری ہے) وہ ایک ناقابلِ تسخیر طوفان کی طرح اقصائے مغرب پر بھی چھا گئے۔ چونکہ قانونِ خداوندی دنیا کی ہر سرزمین پر نافذ ہوتا ہے، اور اس قانون کا مکمل ترین دستور قرآنِ حکیم تھا، لہذا اُن غلامانِ حق نے اس نورِ سرمدی سے ہر ظلمتِ باطل کو چاک کیا، اور بغیر کسی قیام یا حد بندی کے ہر خطۂ ارضی کو عبور کرتے چلے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ :-

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
اور کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا ۱۴۲ صفحہ

یہ شعر بھی ترانۂ ملّی میں سے ہے۔ اندلس صدیوں تک مسلمان حکمرانوں اور غازیوں کا مرجع و مسکن رہ چکا ہے۔ اور انہوں نے قصر الحمرا جیسی عدیم النظیر اور محیّر العقول عمارتیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں طارق بن زیاد سپہ سالار افواج اسلامیہ اندلس پر اس شان سے حملہ آور ہوا تھا، کہ عزم و ہمت اور توکل علی اللہ میں اُس کا جواب نہیں۔

بقولِ اقبالؔ :-

طارق چو برکنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن، باز چوں رسیم
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر مُلک مُلکِ ماست کہ مُلکِ خدائے ماست

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

مسلمان فاتحین نے بصرہ و بغداد کی تسخیر کے لئے موجِ دجلہ ہی کو عبور کر کے وہاں عَلَمِ اسلام بلند کیا تھا۔ اس شعر میں انہیں مجاہدینِ حق کی یلغار کی طرف اشارہ ہے!

خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشتِ پیمائے حجاز
ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز صـ ۱۷۵

یعنی ربِ واحد کا پرستار اور رسولِ صادق کا عاشق جان کا خوف ہرگز نہیں رکھتا، کیونکہ اولیاء اللہ کے لئے از روئے قرآن خوف و غم بالکل بے معنی چیزیں ہیں۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ٥ (پ ۱۱ ع ۱)

ترجمہ: "یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے سچے دوست وہی لوگ ہیں، جن کے دل و دماغ پر خوف اور غم کا کبھی غلبہ نہیں ہوتا۔"

چنانچہ نبی کریمؐ نے جب ہجرت فرمائی تو باوجود خطرات کسی دشمن کے خوف کو دل میں جگہ نہیں دی۔ اور صاحبِ غار ابوبکر صدیقؓ سے فرمایا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (التوبہ) یعنی کفار سے ہرگز مت ڈر، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔"

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی صـ ۱۷۹

غالباً اشارہ ہے سلطان محمود غزنوی کے حملۂ سومنات کی طرف جبکہ اُس نے تمام بتوں کو جذبۂ توحید کے تحت پاش پاش کر دیا تھا۔ جب محمود بُت شکنی کرنے لگا ہے تو اُن دیوتاؤں کے پجاری بے انداز زر و سیم اور جواہرات اس غرض سے پیش کر رہے تھے کہ اُن کے معبودوں کو سلامت رہنے دیا جائے۔ اس موقع پر محمود چاہتا تو "زر و مال" قبول کر کے "بُت شکن" ہونے کی بجائے بآسانی "بُت فروش" بن سکتا تھا، لیکن اُس کے ایمان نے گوارا نہ کیا کہ دولت کو توحید پر ترجیح دے۔ پس اقبال اسی سانحہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو مسلمان قوم کا امتیاز بتاتا ہے کہ:-

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

تو ہی کہہ دے کہ اُکھاڑا درِ خیبر کس نے
شہرِ قیصر کا جو تھا اُس کو کیا سر کس نے ؎۱۷۹

بعض روایات کے مطابق درِ خیبر کو حضرت علیؓ نے اکھاڑا تھا اور قیصر کے شہر یعنی قسطنطنیہ[۱] کو بھی حضرت علیؓ ہی نے فتح کیا تھا۔

---

[۱] "قیصر کا شہر" بھی ہو سکتا ہے کیونکہ دوسرے شعر میں:-
خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار (بلادِ اسلامیہ)

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے!

جب مسلمان مجاہدین نے "آتشکدۂ ایران" پہ حملہ کرنا چاہا تو راستے میں بحرِ ظلمات حائل تھا۔ انہوں نے طوفانِ آب کی بھی کچھ پروا نہ کی، اور اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر بحرِ بلا خیز میں اُتر گئے۔ دوسرے ساحل پہ غنیم کا لاتعداد لشکر موجود تھا۔ دشمنوں نے جب مسلمانوں کی یہ فوق العادت جرأت و ہمت دیکھی تو "دیواں آمدند! دیواں آمدند!" کہتے ہوئے بھاگ گئے، اور اس قدر مرعوب ہوئے کہ مجاہدین کے ان پہنچنے پر انہیں مقابلہ کی تاب ہی نہ تھی۔ اس طرح مسلمانوں نے ایران کو بآسانی مسخر کر لیا، اور وہاں سے بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ چنانچہ بطور مثال زر و جواہر سے مرصع ایک بہت بڑے شاہی قالین کے اتنے ٹکڑے کئے گئے کہ ہر مجاہد کے حصے میں ایک ٹکڑا آیا جو موجودہ قالینوں کے بڑے سے بڑے سائز سے کسی طرح کم نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کو بھی ایک ٹکڑا پہنچا اور آپ نے سلطنتِ ایران کے اس عبرتناک انجام پہ بے اختیار یہ آیۂ شریفہ پڑھی:-

كَمْ تَرَكُوا مِن جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ۝ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ۝ كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ ۝ (پ ۲۵ ع ۱۴)

ترجمہ: (فرعون کے) لوگ کتنے ہی باغ، چشمے، کھیت، عمدہ مکانات اور آرام کے سامان جن میں وہ عیش کرتے تھے، چھوڑ گئے۔ اسی طرح ہم نے ان کو نکالا۔ اور دوسرے لوگوں کو اس (سب سامان) کا وارث کر دیا۔

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
ص ۱۹۸

یہ شعر نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں سے ہے۔ یہ نبی کریمؐ کے ارشاد کی جانب اشارہ ہے کہ "فقر میرے لیے باعثِ فخر ہے"۔ آنحضرتؐ فقرا کی رفاقت کو اغنیا کی مجلس سے زیادہ پسند فرماتے تھے اور انہیں کے حلقے میں زندہ رہے اور انہیں کے گروہ میں وفات پانے کی دعا بھی[1] فرمائی۔ اگر اُس نبی الرحمتؐ کو دولت کی ہوس ہوتی تو اللہ تعالیٰ اُحد پہاڑ کو بھی سونا بنانے کے لیے تیار تھا۔ حد یہ ہے کہ جب مدینہ منورہ کے گلی کوچوں میں مالِ غنیمت کے ڈھیر لگ گئے، اور ہر چیز کی افراط تھی تب بھی آنحضرتؐ نے کسی شے کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اور نہ اسبابِ دنیوی کو اہمیت دی۔ ایک مرتبہ آں حضورؐ مسجدِ نبویؐ کی چٹائی پر سوئے ہوئے تھے اور چٹائی جسدِ مبارک پر جا بجا کھب گئی تھی۔ حضرت عمرؓ تشریف لائے اور چٹائی کے نشان دیکھ کر بے اختیار رونے لگے۔ آنحضرتؐ نے دریافت فرمایا۔ "عمرؓ! روتے کیوں ہو؟" فرمایا: "حضورؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔

---

[1] "جوابِ شکوہ" میں بھی امراء پہ غربا کی فضیلت بیان کی گئی ہے:-

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب   زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب   پردہ رکھتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب

امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غربا کے دم سے

قیصر و کسریٰ جیسے کافر اور فاسق و فاجر لوگ تو عالی شان محلات میں ریشم و کمخواب کے بستر پر سوئیں اور حضور رحمۃ اللعالمین ہو کر بھی چٹائی کے اس تکلیف دِہ فرش پر۔ یہی چیز مجھے رونے پر مجبور کرتی ہے۔" آنحضرتؐ نے فرمایا:۔ "عمرؓ! اُن کا عیش و آرام بالکل عارضی اور وقتی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ دارِ بقا میں دائمی اور ابدی نعمتیں عطا فرمانے والا ہے۔ ہم دائمی کو چھوڑ کر عارضی چیز میں کیوں محو ہوں، اور خسارے کا سودا کیوں کریں۔"

بہرحال اُس فقر کی شان یہ تھی کہ اپنے سامنے زر و سیم کے انبار دیکھ کر بھی فقر ہی رہا، اور دنیوی جاہ و حشم کے متعلق حرص و آز کو دل میں مطلق جگہ نہ دی۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا کہ "ہم نبیوں کے گروہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ہم نہ تو اپنے اجداد سے کسی قسم کی مالی وراثت پاتے ہیں، اور نہ اپنی اولاد کے لئے یہ وراثت چھوڑتے ہیں"۔ اِس سے ثابت ہے کہ اُس "فقر" کا نصب العین سرمایہ ہرگز نہیں تھا، بلکہ تبلیغِ حق اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ اُس کا واحد مطمحِ نظر تھا!

اِس ضمن میں یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ جو فقر نبی کریمؐ کے لئے باعثِ فخر تھا، وہ فقر مخلوق سے قطعی بے نیازی اور خدا کے حضور مکمل نیازمندی کا مفہوم رکھتا ہے، حسبِ آیۂ قرآنی:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝ (پ ۲۲: ع ۱۴)

ترجمہ:۔ اے انسانو تم سب کے سب اللہ کے (دروازے پر) فقیر ہو (محتاج و نیازمند ہو) اور اللہ تو (تمام مخلوق سے) بے نیاز ہے۔ قابلِ حمد و ستائش ہے"!

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے (ص ۲۱۲)

یہ شعر نظم "شمع اور شاعر" میں سے ہے۔ مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے فراموش شدہ فضائل و امتیازات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مسلمان ہی آئینۂ عالم کی [illegible] ہوا ہے، اور وہی زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے۔ "آخری پیغام" سے مراد ہے قرآنِ حکیم جو کتبِ سماوی میں آخری اور مکمل ترین کتاب ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:-

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (پ ۶ : ۳ع)

ترجمہ: "آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا۔ اپنی روحانی و اخلاقی نعمتیں تم پر تمام کر دیں، اور تمہارے لیے (صرف) اسلام کو (بہترین) دین قرار دے کر اس پر تم سے رضامند ہو گیا۔"

پس مسلمان خدا کے آخری پیغام یعنی قرآنِ حکیم کا حامل ہے، اور یہ ایک ایسی فضیلت ہے جو دنیا میں کسی اور ہستی کو نصیب نہیں۔ اور یوں تو نبی کریمؐ نے بھی ارشاد فرمایا کہ "میں آخری پیغمبر ہوں، میری لائی ہوئی کتاب خدا کی آخری کتاب ہے، اور میری امت دنیا کی آخری امت ہے۔"

اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ! تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے؟

یہ شعر بھی نظم "شمع اور شاعر" میں سے ہے۔ فاران مکہ معظمہ میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اس شعر میں اشارہ اُس واقعہ کی جانب ہے جبکہ نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع میں کوہِ فاران کی ایک چوٹی پہ چڑھ کے حاضرین سے پوچھا تھا کہ "بتاؤ، میں نے ایک پیغمبر ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے تمام احکام تم تک پہنچا دیئے یا نہیں" سب نے جواباً کہا۔ بے شک! آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اس پہ نبی کریمؐ نے آسمان کی جانب تین مرتبہ اُنگلی اُٹھائی اور فرمایا۔ "اے خدا گواہ رہ! اے خدا گواہ رہ!! اے خدا گواہ رہ!!!"

پس علامہ اقبال اسی پیمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ! تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے!

"وہ پیمان" یعنی مسلمانوں کا وہ عہدِ مقدس جو اُس نے اپنے ہادی برحق پیغمبر اوّلین و آخرین محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پیروی قرآن کے متعلق کیا تھا!

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں صـ۲۱۹

یہ شعر نظم "حضور رسالت مآب" میں سے ہے۔ طرابلس شمالی افریقہ میں واقع ہے۔ یہ شہر پہلے ترکوں کے قبضے میں تھا۔ سلطان عبدالحمید کے جانشین سلطان محمد کے عہد میں اٹلی کی جانب سے ترکوں کو پے در پے حوادث و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ شریف حسین (جسے شریف مکہ

کہا جاتا تھا) نے برطانیہ سے خفیہ تعلقات استوار کرکے ٹرکی کے خلاف اعلانِ بغاوت کر دیا۔ ایسے مخدوش ماحول میں ٹرکی کو اپنے حفظ و بقا کے لئے ناچار اٹلی سے جنگ کرنا پڑی، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ طرابلس میں ایک نہایت خونریز معرکہ ہوا، اور وہ شہر ترکوں کے قبضے سے نکل گیا، اسی جنگ میں ایک شخص عبداللہ نے کفار کے مقابل تن من دھن سے جو قربانیاں پیش کیں، وہ بے نظیر آپ ہیں، اور جہاد فی سبیل اللہ کا ایک مکمل نمونہ ہیں۔ اس مجاہدِ اسلام کی ایک بیٹی فاطمہ تھی جس کی ہمت و جرأت، عزم و استقلال، اور جذبۂ ایمانی نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ کافروں کو بھی تصویرِ حیرت بنا دیا تھا۔ چنانچہ وہ مجبوبۂ خداوند میدانِ جنگ میں ترک مجاہدین کو پانی پلاتی ہوئی نتیجہ کار خود بھی جامِ شہادت نوش کر گئی۔ علامہ اقبال نے "فاطمہ بنت عبداللہ" کے عنوان سے ایک مستقل نظم تحریر فرما کر اس زندہ جاوید خاتون کو خراجِ عقیدت ادا کیا ہے:-

فاطمہ! تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں اُنکی اس مرقد سے میں

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور

جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی ضو ناآشنا ہے قیدِ صبح و شام سے

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں
صـ ۲۲۱

یہ شعر "جوابِ شکوہ" میں سے ہے مصرع میں کولمبس کی طرف اشارہ ہے جس نے گوناگوں مصائب و موانع کے باوجود آخرکار نئی دنیا (امریکہ) کو ڈھونڈھ ہی نکالا تھا۔

بُت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بُت گر ہیں
تھا براہیمؑ پدر اور پسر آذر ہیں!
صـ ۲۲۲

یہ شعر بھی "جوابِ شکوہ" میں سے ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو بُت شکن اور آذر کو بُت گر قرار دیا گیا ہے۔ اس شعر میں خلیل اللہ کی بُت شکنی کی جانب جو اشارہ ہے اُسکی تفصیل صفحہ ۱۶۱ پر

ملاحظہ فرمائیں۔ آذر کا جو بتکدہ قوم کے دیوتاؤں سے معمور تھا، وہ حضرت ابراہیمؑ نے اُس خلوت کی گھڑی میں چکنا چور کر ڈالا، جبکہ تمام قوم سالانہ میلہ منانے کے لئے باہر جا چکی تھی۔

حاصلِ شعر یہ ہے کہ موحّد آباؤ اجداد کی اولاد آج بدترین طریق پر مشرک و بُت پرست ہو رہی ہے!

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم ش ۲۳

یہ شعر بھی "جوابِ شکوہ" ہی سے ہے۔ "قلبِ سلیم" کی ترکیب سے اشارہ مقصود ہے اس آیۂ قرآنی کی طرف:۔

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ۝ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ
(صٰفّٰت : ۷ ع ۳)

ترجمہ: "اور اُسی کے طریق پر چلنے والوں میں سے ابراہیمؑ بھی تھے، جبکہ اپنے پروردگار کے حضور قلبِ سلیم لے کر آیا۔"

یعنی "قلبِ سلیم" یا صحیح سلامت دل، وہ دل ہے جو شرک، خود غرضی، حرص و آز، بدباطنی اور فسق و فجور کی آلائش سے پاک رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا مسکن ہو۔ بقول اقبال دنیا میں اوجِ ثریا پر صرف وہی لوگ مقیم ہو سکتے ہیں جو صاحبِ قلبِ سلیم ہوں، جو صحیح معنوں میں موحد اور متقی ہوں!

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

یہ شعر بھی "جوابِ شکوہ" میں سے ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں کودنے اور اُس کے گلزار بن جانے کا واقعہ صفحہ ۱۲۹ پر بالتفصیل مذکور ہے۔ اُس واقعہ کی روشنی میں یہاں فقط شعر کا مقصد جان لینا کافی ہے اور وہ یہ ہے کہ دُنیا میں مافوق العادت اور محیّر العقول چیزیں اگر ظہور پذیر ہو سکتی ہیں، اور اگر دشمنانِ اسلام کو امدادِ غیبی سے شکستِ فاش دی جا سکتی ہے تو وہ فقط ایمانِ محکم کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ اِسی بنا پر ایک اور شعر میں فرمایا ہے۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سامان بھی ہے!

"وہ سامان" سے مراد ہے "قوّتِ ایمانی" اور جذبۂ حق پرستی!

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسفؑ ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا ۱۲۹

اِسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے، اور قرآن کا حکم و قانون دُنیا کے ہر خطّے پر یکساں قوّت سے نافذ ہوتا ہے، لہٰذا مُسلمان کے نزدیک "وطن" کا نظریہ قطعاً بے معنی ہے۔ روئے زمین کا ہر خطّہ مسلمان کا وطن ہے، اور ہر مُسلمان (خواہ وہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو) اُس کا بھائی ہے اور مساویانہ حقوق کا مستحق ہے۔

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی!
(اقبالؔ)

پس مسلمان کی انہیں عالمگیر روحانی اور عملی صلاحیتوں کے پیشِ نظر فرمایا کہ:۔

تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

یعنی نوعِ انسانی میں تجھے وہ بلند مرتبہ حاصل ہے کہ دُنیا کا ہر ملک اور ہر خطہ تیرا وطن ہے، کنعان حضرت یوسف کا وطن تھا۔ بھائیوں کی سازش نے انہیں کنعان سے نکال کر جنگل کے ایک کنویں میں پھینک دیا، اور مختلف حادثات دیکھنے کے بعد وہ مصر پہنچے اور عزیزِ مصر کے غلام بنے۔ ان کا زہد و تقویٰ اور صبر و ضبط آخر کار خدائے عادل کے نزدیک اس انعام کا مستحق ہوا کہ انہیں مصر کے تاج و تخت کا وارث بنا دیا گیا۔ اس طرح وہ اپنے وطن (کنعان) کی وابستگی سے بے نیاز ہو کر سرزمینِ مصر پر متمکن ہوئے، اور وہاں صدہا سال تک اولادِ یعقوب پھولی پھلی، جسے بعد میں "بنی اسرائیل" کہہ کر پکارا گیا۔

نظریۂ "وطن" کے بطلان پر علامہ مرحوم کے مندرجہ ذیل اشعار بھی نہایت مؤثر و معنی خیز ہیں:۔

اِس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنّتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے	تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے	کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیّتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

چشمِ اقوام یہ نظّارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ دیکھے ص ۲۳۱

یہ شعر بھی "جوابِ شکوہ" میں سے ہے۔ یہ "نظارہ" یعنی آنحضرتؐ کی عظمت و سطوت اور دوام و احترام کا نظّارہ مصرعِ دوم میں اس آیۂ شریفہ کی جانب اشارہ ہے:-

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۙ

(پ: ۳۰ ع)

ترجمہ:- "اے پیغمبر! کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھولا؟ اور ہم نے تیرا بوجھ تجھ سے اتار دیا، وہ بوجھ جس نے تیری پیٹھ توڑ رکھی تھی، اور ہم نے تیرا اسم مقدس دہر دو جہان میں، بلند کر دیا۔"

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار　ص ۲۵۱

یہ شعر نظم "صدیق" میں سے ہے، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضرتؐ کو ان الفاظ میں مخاطب فرماتے ہیں: "باعثِ تکوینِ روزگار" میں صریحاً اشارہ ہے اِس حدیثِ قدسی کی جانب کہ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ یعنی "اے نبیؐ! اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا تو کائنات کو پیدا نہ کرتا۔"

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند
تیری خدمت سے ہُوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند　ص ۲۵۶

یہ شعر نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کے تحت میں واقع ہُوا ہے، وہ جواں سے اشارہ مقصود ہے اپنے برادرِ اکبر شیخ عطا محمدؒ کی جانب جو جسمانی طور پر واقعی سروِ بلند ہے، اور جن کی شفقت و محبّت اور بے لوث امداد و اعانت سے علّامہ اقبالؔ نے اپنے تعلیمی مدارج اطمینان سے طے کئے، اور مشرق و مغرب کے علوم سے بہرہ ور ہوئے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار (اور قوم کے لئے ہنوز نامعلوم) حقیقت ہے کہ علّامہ اقبال موجودہ اقبالؔ اور ایک عالمگیر شخصیت نہ ہوتے اگر بڑے بھائی کی ہمدردی، حوصلہ افزائی اور مسلسل امداد و اعانت اُن کے شاملِ حال نہ ہوتی۔ چنانچہ اقبالؔ کو دوسرے شعر میں بالفاظِ خود اس احسانِ عظیم کا اعتراف ہے:-

کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا　　وہ محبّت میں تری تصویر، وہ بازو مرا

کہتے ہیں اہلِ جہاں دردِ اجل ہے لادوا
زخمِ فرقت، وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا صفحہ ۲۶۲

یہ شعر بھی "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کے تحت واقع ہوا ہے۔ مصرع دوم میں یقینی طور پر اشارہ کیا جارہا ہے انگریزی کے اس مشہور مقولہ کی جانب کہ:- (Time is a Great Healer)

یعنی ہجر و فراق یا مصائب و حوادث کے زخموں کو مندمل کرنے والا بہترین مرہم وقت ہے "وقت" سے مراد امتدادِ زمان اور مرورِ ایّام ہے۔ چنانچہ تجربہ بتاتا ہے کہ کسی حادثہ سے دل میں کتنا ہی گہرا زخم واقع ہو، ہفتے، مہینے اور سال گزرنے سے روز بروز رنج و غم میں تخفیف ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ انسان زندگی کے بدترین حادثات کو بھی بالکل فراموش کر بیٹھتا ہے مثلاً کسی شخص کی موت پر بیشتر اقربا یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں کہ اس غم سے تو ہم بھی عنقریب ہلاک ہو جائیں گے وہی شخص زیادہ سے زیادہ ایک سال تک گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا دیا جاتا ہے اور اُس کے غم موت میں ہلاک ہونے والے عزیز اُس کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کی بجائے کوئی پُر عشرت اور قہقہہ انگیز ڈرامہ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

بہرکیف وقت کی رفتار سے رنج و غم کا محو ہونا ایک نفسیاتی حقیقت ہے، کیونکہ وقت ہی ہر زخم کا بہترین مرہم ہے۔ بھلا ہو وقت کی اس صحت بخش پرواز کا، ورنہ چشمِ زدن میں تمام دنیا قبرستان بن جاتی۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
ہیں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آذری ص ۲۸۴

یہ شعر نظم "میں اور تو" میں سے ہے۔ کلیم کا سلیقہ یہ ہے کہ وہ حق پرست ہونے کی حیثیت میں فرعون اور آلِ فرعون کے ظلم و استبداد کے خلاف اعلانِ بغاوت کرتے ہوئے کمزور و بے بس لوگوں کی حمایت کرے۔ اسی طرح خلیل کی شان یہ ہے کہ وہ بُت کدۂ آذر کو پاش پاش کرے اور تبلیغ حق میں اغراضِ نفسانی اور مفادِ ذاتی کو قطعاً دخل نہ دے۔ چنانچہ حضرتِ اقبال فرماتے ہیں۔ کہ میں تو پیروِ موسٰیؑ ہونے کی بجائے سحرِ سامری سے مرعوب ہوں، جس نے بچھڑے کا شعبدہ دکھا کر خلقِ خدا کو گمراہ کیا تھا، اور تو خلیل کا پیروکار ہونے کی بجائے آذر کے جاہ و جلال اور مسلکِ بُت پرستی کا غلام ہے۔ حاصل یہ کہ ایمان و عمل کا الٰہی دستور آج مسلمان قوم میں معدوم و مفقود ہے!

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسدالّلٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

یہ شعر بھی نظم "میں اور تو" میں سے ہے۔ یہ اشارہ ہے اُن معرکہ ہائے حق و باطل کی جانب جو اسداللہ الغالب حضرتِ علی اور مرحب و عنتر کے درمیان ہوئے۔ مرحب اور عنتر عرب کے وہ قوی ہیکل اور مشہور و معروف پہلوان تھے۔ جنہیں حضرتِ علی نے کئی اکھاڑوں میں بری طرح پچھاڑا تھا۔ اس بنا پر شعر کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں آج بھی اگر ایک طرف حضرت علی کا زورِ بازو

اور جذبۂ تسخیر موجود ہے، تو دوسری طرف مرحب و عنتر کی باطل پرست اور مغلوب عن الحق فطرت بھی موجود ہے۔ لیکن نہ تو جنگ و جدل کے وہ اکھاڑے دکھائی دیتے ہیں، اور نہ کسی کو ایک دوسرے کا حریف بننے کا شوق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مومن میں قوتِ ایمانی مفقود ہے، اور کافر اپنے کفر میں بھی کمزور پایا جاتا ہے۔ اسی مفہوم میں "اسرارِ خودی" کے مندرجہ ذیل اشعار پر بھی غور فرمائیے۔ شیخ برہمن کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن
پشت پا بر مسلکِ آبا مزن
تو کہ ہم در کافری کامل نۂ
در خورِ طوفِ حریمِ دل نۂ
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور
تو ز آذر من ز ابراہیم دور
قیسِ ما سودائیِ محمل نشد
در جنونِ عاشقی کامل نشد
مُردہ چوں شمعِ خودی اندر وجود
از خیالِ آسماں پیما چہ سود؟

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسٰےؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش ص ۲۸۹

یہ شعر نظم "خضرِ راہ" میں سے ہے۔ حضرتِ خضر اور حضرتِ موسٰےؑ کی ملاقات اور بعد ازاں کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم کے پر اسرار واقعات کی جانب اس شعر میں جو اشارات موجود ہیں، وہ سورۂ کہف میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ حضرتِ خضر کو جو "علمِ لدنی" حاصل تھا۔ اس کے تحت اُن پر غیب کی خبریں منکشف ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ ان اخبار و احکامِ الٰہی کے سلسلے میں اُن سے ایسی حرکات ظہور میں آتی تھیں کہ دانا و اور علمِ موسٰےؑ بھی انہیں دیکھ کر "حیرت فروش" بن جاتا تھا۔ چنانچہ جب حضرتِ موسٰیؑ دریا کے کنارے حضرتِ خضر کی زیارت کر پاتے ہیں، تو انتہائی نیاز مندی سے کہتے ہیں:۔

موسٰیؑ:۔ اے حریمِ ذات کے رازدار خضرؑ! اے سیر و سیاحت اور تحصیلِ معرفت کے تشنہ کام مسافر! مجھے بھی فہم و بصیرت کے اُس گنجینے سے بہرہ ور کر جس سے خدائے ذوالجلال کی بے دریغ فیاضی نے تجھے مالا مال کیا ہے!

خضرؑ:۔ اے موسٰےؑ! اگر میں تجھے اپنی رفاقت اور ہمراہی کے لئے موزوں سمجھتا تو مجھے تیرا مطالبہ پورا کرنے میں انکار کی کوئی وجہ نہ تھی، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تو میری واردات و حرکات پر صبر نہ کر سکے گا۔ میں مجبور ہوں، تیرا مسلک کچھ اور ہے اور میرا ضابطہ کچھ اور، عقل عشق کے حیرت خیز کارناموں کو دیکھ کر بیتاب ہو سکتی ہے لیکن عشق خود کو ایک ناقص و ادنےٰ شئے کی رفاقت سے پریشان نہیں کر سکتا!

موسٰیؑ :- نہیں، اے برادرِ محترم! آج میری یہ آرزو پوری ہونی چاہیئے۔ میں فقط آپ کی صحبت سے مستفید ہونا چاہتا ہوں، اور آپ کے معاملات میں ہرگز دخل نہیں دوں گا۔

خضرؑ :- بہت اچھا، اس چیز کا فیصلہ پیش آمدہ واقعات پر ہے، اور میں دیکھوں گا کہ آپ ان کی بجا آوری میں ضبط و خودداری کا کس قدر ثبوت دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس دوران میں میری طرف سے جو کچھ سرزد ہو، اس پر آپ کو کسی قسم کا سوال و اعتراض نہیں اٹھانا ہوگا!

موسٰیؑ :- آپ مطمئن رہیں، میں آپ کے حکم کی تعمیل بدل و جان کروں گا۔ اور کوئی حادثہ میری خاموشی اور متابعت میں خلل انداز نہیں ہو سکے گا!

یہ کہہ کر موسٰیؑ خضرؑ کے ہمراہ ہو لئے۔ اس ہمراہی کا سب سے پہلا اثر دریا کے سفر میں ظاہر ہوا۔ دونوں کشتی پر سوار تھے، لیکن جب اس پار پہنچے تو حضرت خضرؑ نے کشتی میں ایک طرف سے دیدہ و دانستہ سوراخ کر دیا۔

موسٰیؑ :- (ہمدردی اور حیرت کے جذبات سے مجبور ہو کر) اے حضرت! آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ ایک تو اس غریب کی کشتی میں سوار ہو کر دریا کو عبور کیا، اور پھر اس احسان کے عوض بیٹھے بیٹھائے اس کی کشتی توڑ ڈالی۔ یہ کہاں کا دستورِ اخلاق ہے!

خضرؑ :- اے موسٰیؑ! میں نہ کہتا تھا کہ تیری عقلِ ظاہر بیں قدرت کے اسرار و غوامض کا احاطہ نہیں کر سکے گی، اور تو شش کے مافوق العادت کارناموں کو دیکھ کر بے خود ہو جائے گا۔

موسیٰؑ:۔ بے شک مجھ سے بھول ہوئی، اور میں فرطِ حیرت سے بول اُٹھا، اس دفعہ معافی کا خواستگار ہوں، آئندہ یہ غلطی نہیں ہوگی۔

بعد ازاں خضرؑ اور موسیٰؑ پھر روانہ ہوئے، چلتے چلتے راستے میں ایک لڑکا دکھائی دیا، اور خضرؑ نے گلا گھونٹ کر آناً فاناً اُس کو ہلاک کر دیا۔

موسیٰؑ:۔ (غضبناک ہوکر) ایں! اس معصوم ہستی نے آپ کا کیا قصور کیا تھا کہ بلاوجہ اُس کی جان لے لی۔ میری روح اس ظلم و جور کو دیکھ کر خوفِ خداوندی سے لرزاُٹھی ہے!

خضرؑ:۔ موسےٰؑ اپنے وعدہ کو یاد کر اور نادانی سے باز آ۔ تو بار بار اپنے عہد و پیمان کو توڑ رہا ہے، لہٰذا میں تجھے اپنے سے جدا کرنے پر معذور ہوں۔

موسیٰؑ:۔ افسوس! حادثات کی سخت اور ناقابلِ برداشت ضرب میرے شیشۂ تحمل کو پاش پاش کئے دیتی ہے، اور میں بے اختیار گفتگو کرنے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔ مگر خیر، اس مرتبہ اپنے عہد کی پابندی نہ کر سکا تو خود بخود آپ سے جُدا ہو جاؤں گا۔ آپ مجھے کچھ اور مہلت دیں!

خضرؑ:۔ بہت اچھا، یہ تمہارا آخری موقع ہے۔ اگر اب بھی تم نے میرے معاملات میں بدستور مداخلت کی، تو پھر میں ہمیشہ کے لئے تمہیں خیرباد کہہ دوں گا!

دونوں پھر سفر پر روانہ ہوئے، منزل کے بعد سے شکستہ و رنجیدہ بالآخر ایک بستی کے قریب پہنچے۔ بھوک شدت سے ستا رہی تھی۔ اس لئے اہالیانِ قریہ سے طعام کی درخواست کی، لیکن وہ کچھ ایسے روکھے پھیکے اور بے مروّت لوگ ثابت ہوئے کہ اُنہوں نے اِن کی بات پر کان نہ دھرا۔

بیہر دو رفیق کھانے سے مایوس ہو کر جنگل کا رُخ کئے ہوئے تھے کہ خضرؑ نے ایک شکستہ و کہنہ دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی۔ انہوں نے موسیٰؑ کی معیت میں اُس کی تعمیر شروع کر دی موسےؑ بھوک کی بیتابی سے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے رہے۔ مگر ایک تو پاسِ عہد کے خیال سے دوسرے مزدوری کی اُمید پر برابر کام کرتے چلے گئے۔ بالآخر دیوار مکمّل ہو گئی، اور جب خضرؑ نے کسی شخص سے بھی اُجرت کا مطالبہ نہ کیا تو موسےؑ جھٹ بول اُٹھے:۔

موسیٰؑ:۔ اجی حضرت! آپ نے یہ اصولِ کار کہاں سے سیکھا ہے کہ بھوک سے اپنی جان پر بن رہی ہو کوئی کھانا تک نہ پوچھے، اور خالی پیٹ دیوار تعمیر کرتے کو کھڑے ہو جائیں۔ آخر جسے ضرورت ہوتی وہ خود اپنا کام کرا لیتا۔ ہمیں اس بیگار میں سیان کھپانے کی کیا ضرورت تھی؟

خضرؑ:۔ موسےؑ! حجّت پوری ہوئی اور تو اپنا قول ہار گیا اب سُن، کہ عقل جن چیزوں کو سطحی نظر سے دیکھ کر حیرت زدہ ہوتی تھی، اور ذہن و شعور کی فرومائگی جن حقائق کا احاطہ کرنے سے عاجز رہی، عشق نے اُن میں کیا مصلحت رکھی ہے، اور حکمتِ الٰہی کا کیا منشاء ہے کشتی میں نے اس لئے توڑی تھی کہ اُس کے مالک چند غریب لوگ تھے۔ علاقہ کا حاکم ایسا ظالم و جابر شخص تھا جو تمام کشتیاں ذاتی ضروریات کے لئے غصب کر لیا کرتا تھا۔ لہٰذا میں نے برسبیل احتیاط اس میں سوراخ کر دیا کہ وہ اس ظالم و غاصب کی زد سے محفوظ رہے۔ پھر لڑکا میں نے اس بنا پر ہلاک کیا کہ میں نے اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر اُس میں کفر و سرکشی کے ایسے آثار دیکھے جو بعالمِ شباب نمایاں ہو کر خلقِ خدا کے لئے ایذا اور گمراہی کا باعث ہوتے۔ اس لڑکے

کے والدین صالح اور ایماندار تھے، پس منشاءِ الٰہی کا منشاء یہ تھا کہ مومن والدین کو اس پیش آنے والے فتنہ سے نجات دلائی جاتی۔ اور بالآخر دیوار میں نے اِس لئے تعمیر کی کہ اُس کے نیچے ایک خزانہ مدفون ہے۔ جس کا تعلق دو ایسے یتیم بچوں سے ہے جن کا کوئی والی وارث نہیں، سو قدرت نے مناسب جانا کہ ان کا یہ حق اُن کے بالغ ہونے تک چوری چکاری سے محفوظ رہے، اور بعد ازاں وہ اس سے آرام کی زندگی بسر کریں۔ یہ ہیں وہ تین چیزیں جو سراسر خدا کے اشارے سے عمل میں آئی ہیں جنہیں صرف "عشق" ہی ادراک کر سکتا ہے اور جن میں عقل کو سوائے انتشار کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سو فرائض کے لحاظ سے تیرا لائحۂ عمل کچھ اور ہے اور میرا طریقِ کار کچھ اور۔ تو فقط ظواہر پر حکم لگاتا ہے۔ اور میں باطن کی دُنیا سے تعلق رکھتا ہوں۔ لہٰذا میں تجھ سے مطمئن نہیں ہو سکتا، اور نہ تو مجھ سے نہیں۔ پس خدا کی اِس قائم کردہ تقسیم پر شاکر رہ، اور اُس مقامِ راز اور نہاں خانۂ لاہوت تک پرواز کرنے کی کوشش مت کر جہاں پہنچنے کے لئے تیرے بازو میں خاطر خواہ توانائی نہیں! ع

ہر کسے را بہرِ کارے ساختند!

مندرجہ بالا واقعات راقم الحروف کی خود ساختہ داستان نہیں، بلکہ اس مکالمہ کے عناصر سراسر قرآنِ حکیم کے بیان کردہ واقعات سے ماخوذ ہیں۔ پس اِن واقعات کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل شعر کے اشارات باسانی سمجھے جا سکتے ہیں:-

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم — علمِ موسےٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش!

گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ نائے و نوش ص۲۹۱

یہ شعر بھی نظم "خضرِ راہ" میں سے ہے۔ اس کی سند ہو یا نہ ہو، لیکن عام طور پر مشہور ہے کہ جب حضرت خضر چشمۂ آبِ حیات کی جستجو میں نکلے تو سکندر بھی اس کی تمنا میں ساتھ ہو لیا۔ سکندر آبِ حیات کی آرزو اس لئے رکھتا تھا کہ ایک طویل زندگی پا کر تمام دنیا کو مسخر کرلے۔ پھر کیف حسبِ روایت حضرت خضر تو چشمۂ آبِ حیواں کی تاریکیوں کو بے تکلّف عبور کرتے ہوئے اس تک جا پہنچے اور پانی پی لیا۔ لیکن سکندر شومیٔ قسمت سے وہاں تک رسائی حاصل نہ کرسکا اور یہ حسرت اس کے دل میں جوں کی توں رہی[۱]۔ چنانچہ اسی واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے علّامہ مرحوم فرماتے ہیں، کہ سکندر گو آبِ حیات سے محروم رہا، مگر اس کی فطرت ہنوز وہ پانی پینے میں صرف ہے۔ حاصل یہ کہ آرزوئیں محرومِ مقصد رہ کر بھی سرگرمِ جدّوجہد رہتی ہیں۔ اور فطرت کا عمل کسی حالت اور کسی زمانے میں بھی مسدود و معطل نہیں ہوتا۔

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل ص۲۹۲

---

[۱] غالب نے بھی اس واقعہ کی جانب اپنے رندانہ یا یوں کہئے کہ گستاخانہ انداز میں اشارہ کیا ہے:

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

یہ شعر بھی نظم "خضرِ راہ" میں سے ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے ہوش سنبھالتے ہی جب ستارے کو دیکھا تو اُس کی چمک دمک سے متاثر ہو کر کہہ اُٹھے کہ شاید یہ میرا خدا ہے۔ جب یہ ستارے محو ہوئے اور چاند نے اپنا جلوہ دکھایا تو فرمایا یہ ستاروں سے بدرجہا زیادہ روشن ہے لہٰذا یہ میرا معبود ہے، لیکن جب چاند غائب ہوا، اور آفتاب نے دُنیا کو بقعۂ نور بنایا تو بے اختیار کہہ اُٹھے "یہی میرا اصل رب ہے، کیونکہ یہ سب سے بڑا ہے۔" پھر یہ "ربِّ اکبر" بھی جب زرد و بے نور ہو کر غروب ہوتا ہوا دکھائی دیا تو بنتیجہ کار خلیل اللہ نے فرمایا کہ "میں غروب ہونے والی ہستیوں سے محبت نہیں کر سکتا۔" بہ اِس لئے کہ معبودِ حقیقی کو غروب و زوال کی قیود سے قطعی طور پر آزاد ہونا چاہئیے۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا ہے:۔

جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ

یعنی ایک مسلسل مشاہدۂ قدرت کے بعد جب کائنات کی روشن ترین اور مفید ترین چیز (آفتاب) بھی زوال پذیر دیکھا تو آنکھ نورِ معرفت سے زیادہ روشن ہوئی اور اُس کی نگاہِ حقیقت رس نے جسدِ باری تعالیٰ کو کما حقہٗ دیکھ لیا۔ قرآن حکیم میں یہ واقعہ بالفاظِ ذیل مذکور ہے:۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ	ترجمہ:۔ اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمان اور زمین کی بڑی چیزیں دکھلانے لگے، تا کہ وہ (اُن کے مشاہدے سے) پورے یقین والوں میں سے ہو جائے۔ چنانچہ جب رات کی تاریکی اُس پر چھا

قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۰ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ج فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ ۰ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ ج فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۰ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۰ (پ: ۱۴ع)

گئی اور اُس نے ستارے کو جگمگاتے ہوئے دیکھا، تو کہنے لگا یہ میرا مالک ہے۔ جب وہ تارا ڈوب گیا تو کہنے لگا میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر جب اُس نے چاند کو ضیا پاشی کرتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا یہ میرا مالک ہے جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہنے لگا اگر میرا حقیقی مالک مجھے راہِ راست نہ دکھائے گا تو میں بھی گمراہ لوگوں میں جا ملوں گا، پھر جب اُس نے سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا یہ میرا مالک ہے کیونکہ یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہنے لگا بھائیو! میں تو ان چیزوں سے بیزار اور کنارہ کش ہوں جن کو تم خدا کے ساتھ شریک مانتے ہو۔ میں نے تو ایک ہی پروردگار کا بندہ ہو کر اپنا منہ اُس کی طرف پھیر لیا ہے جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا، اور میں مشرک لوگوں میں سے نہیں ہوں۔"

اِن تاثرات سے ثابت ہے کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اُس کی صفات کو کما حقہٗ سمجھنے پر آمادہ ہو تو فقط تدبّر فی الکائنات اور معرفتِ موجودات ہی اُس کی رہنمائی کے لئے ازبس کافی ہے۔ یہی اصول تدبّر اور مشاہدۂ قدرت روحِ ایمان اور جانِ توحید ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم میں "عقلمند" کا خطاب ہی فقط اُن لوگوں کو دے رہا ہے جو آسمان و زمین کی مخلوقات میں غور کرتے ہیں لیل و نہار کے تغیّر کو نگاہِ حکمت سے دیکھتے ہیں، اور کثرتِ ذکرِ الٰہی کرتے ہیں نتیجہ اس غور و تدبّر کا یہ برآمد ہوتا ہے کہ اے معبود! کائنات کا یہ تمام کارخانہ تو نے فضول و بے سود نہیں بنایا، بلکہ اس کا خالق و مدبّر تو ہے، اور قانونِ جزا و سزا میں کوئی شبہ نہیں۔

پس اولادِ خلیلؑ کو چاہیئے کہ آنکھوں کو نورِ توحید سے روشن کرنے کے لئے تفکّر فی الخلق کا وہ ذوق و شوق پیدا کرے، جس کا تذکرہ مندرجہ ذیل آیات میں ہے:۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

ترجمہ:۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے آنے جانے میں عقلمندوں کے لئے (قدرتِ باری تعالیٰ کی) نشانیاں ہیں، وہ عقلمند جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (غرض ہر حالت میں) یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (بہ نگاہِ معرفت) غور و خوض کرتے ہیں۔ (اور پھر نتیجہ کار کہتے ہیں) اے پروردگار!

تو نے کائنات کا یہ کارخانہ بے کار و لا حاصل نہیں
بنایا، تیری ذات (شرکت سے) پاک ہے، تو ہمیں
دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سِرّ آدم ہے ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی! ص۲۹۳

یہ شعر بھی نظم "خضرِ راہ" میں سے ہے۔ قرآن حکیم میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے
کائنات کو پیدا کرنا چاہا تو حکم فرمایا "کُن" یعنی "ہو جا"، فَیَکُوْنُ۔ پس تمام چیزیں پیدا ہو گئیں۔
اور ایک جگہ فرمایا:-

اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۔ (پ۲۳: ع۳)

ترجمہ:- "اُس کی تو یہ شان ہے کہ جب کوئی چیز بنانا چاہتا ہے تو اُس سے فرما دیتا ہے "ہو جا" پس وہ ہو جاتی ہے"!

اِس بنا پر علامہ مرحوم فرماتے ہیں کہ حکمِ کُن کا حقیقی مقصد و مرجع چونکہ بنی آدم کی زندگی تھی
لہٰذا اے انسان! اپنی قوت و عظمت کو پہچان اور ممکناتِ فطرت کو عمل میں لا۔ غیروں سے بے
نیاز ہو کر اپنی دنیا آپ پیدا کر!

اسی مفہوم کو "اسرارِ خودی" کے مندرجہ ذیل اشعار میں بوجہِ احسن پیش کیا
گیا ہے:-

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن — ہست در میداں سپر انداختن
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار

خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
صـ۲۹۴ تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

یہ شعر بھی "خضرِ راہ" میں سے ہے۔ اس شعر میں اشارہ ہے سائنس کے اس مسئلہ کی جانب کہ کوئلے آفتاب کی مسلسل شعائیں کھا کھا کر بالآخر جواہرات بن جاتے ہیں۔ بدخشاں ایک ملک کا نام ہے جو خراسان اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے، اور وہاں جواہرات کی کان ہے۔ اس لحاظ سے علامہ مرحوم کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان مشرق کی سرزمین پر اپنی جملہ صفاتِ ایمانی کے ساتھ یوں چمک اٹھے کہ اس کی تجلیات سے سنگ ریزے (جاہل و بدعمل لوگ) بھی لعلِ گراں

(عالم باعمل لوگ) بن جائیں؛ یا یہ کہ مسلمان کے فیضِ روحانی سے کفّار کو بھی ایمان کی نعمت نصیب ہو! باقی رہا کوئلوں کے لعل بننے کا مسئلہ، تو اس کی جانب "اسرارِ خودی" میں بھی بعنوان "حکایت الماس وزغال" اشارہ پایا جاتا ہے :-

گفت با الماس در معدن زغال ۔۔۔ اے امینِ جلوہ ہائے لازوال
ہمدمیم و ہست و بودِ ما یکیست ۔۔۔ در جہاں اصلِ وجودِ ما یکیست
من بیکاں میرم ز دردِ ناکسی ۔۔۔ تو سرِ تاجِ شہنشاہاں رسی

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْكَ
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری ص ۲۹۵

یہ شعر بھی نظم "خضرِ راہ" میں سے ہے۔ مصرعِ اوّل میں اشارہ ہے اس آیۂ قرآنی کی جانب :-

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ج (پ ۱۹: ع ۱۷)

ترجمہ: "بادشاہ جب کبھی کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں، تو اسے درہم برہم کر دیتے ہیں، اور ان کے ہاتھوں شہر کے معزز لوگ بھی ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں۔"

جب تک اس آیۂ شریفہ کی شانِ نزول اور روایتی پس منظر کا تذکرہ نہ کیا جائے اس کے مقصد و منشا سے خاطر خواہ طور پر محظوظ ہونا ناممکن ہے۔

سلیمان علیہ السلام نے بلقیس ملکۂ سبا کو ایک چٹھی لکھی تھی جس میں اسلام کی جانب دعوت دی گئی تھی۔ یہ چٹھی ہُدہُد نے بلقیس کی خوابگاہ میں جا کر پھینک دی۔ اُس نے بیدار ہو کر خوف و ہراس سے پڑھی۔ لکھا تھا:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۔ (پ ۱۹: ع ۱۶)

ترجمہ:۔ "شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت رحم والا اور مہربان ہے۔ میرا منشاء مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنے زور و قوت سے مرعوب مت کرو۔ اور مطیع و فرمانبردار بن کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ!"

وہ فوراً گھبرا گئی اور اپنے امراء وزرائے سلطنت کو جمع کر کے اُن کا مشورہ طلب کیا کہ حضرتِ سلیمانؑ کو جواب کیا دیا جائے۔ سب نے اپنے نشۂ قوت میں یہی رائے دی کہ اطاعت اختیار کر کے سلیمان کے پاس جانا اور اُس کا دین قبول کرنا ہماری ذلت و توہین ہے۔ ہم صاحبِ قوت ہیں۔ کافی ساز و سامان کے مالک ہیں، لہٰذا اب جنگ ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ بلقیس چونکہ محض جذباتی قسم کی سرکش عورت نہیں تھی، فہمیدہ اور عاقبت اندیش تھی۔ لہٰذا اُس نے اپنے فیصلہ کُن جواب میں جہاں دنیا کے ستیزہ جُو شہنشاہوں کا ایک عالمگیر کیرکٹر بیان کیا، وہاں جنگ جیسی لعنت سے پیدا ہونے والی تباہ کاریوں اور مصیبتوں کا ذکر بھی کر دیا۔ یہ جواب نہایت مختصر مگر مفہوم کے لحاظ سے نہایت بلیغ اور جامع ہے۔ یعنی:۔ اِنَّ الْمُلُوْكَ الخ

پس بلقیس کا جواب سن کر سرداروں اور وزیروں نے اس کی معقولیت کو ٹھنڈے دل سے جانچا، ملکہ کی رائے سے متفق ہوئے، اور مملکتِ سلیمان میں اطاعت شعار اور صلح جو لوگوں کی طرح داخل ہوئے۔

مصرعِ دوم میں فرماتے ہیں کہ اقوامِ غالب کی سلطنت بھی ایک طرح کی جادوگری ہے۔ چنانچہ اسی جادو کا اثر ہے کہ محکوم کو اپنے حاکم کی قبیح و مذموم چیزیں بھی حسین و جمیل دکھائی دیتی ہیں:۔

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری ص ۲۰۵

"اسرائیل" سریانی زبان میں "عبداللہ" کا مفہوم رکھتا ہے، اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو پے در پے مصائب کے بعد اللہ تعالیٰ نے مصر کے تخت پر متمکن کیا، تو انہوں نے اپنے بارہ بھائیوں اور والدِ محترم کو کنعان سے مصر میں بلایا تھا۔ اس طرح یہ خاندان شام سے ہجرت کر کے مصر میں مستقل طور پر مقیم ہو گیا تھا۔ اس بنا پر ان بھائیوں کی جس قدر اولاد اس سرزمین میں پھیلی وہ بنی اسرائیل کہلائی۔ بعد ازاں فرعون کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی کہ وہ بھی بنی اسرائیل میں سے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہ صرف فرعون کے

دعوئے خداوندی اور گوناگوں مظالم کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بلکہ فتنۂ سامری سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا، جو خلقِ خدا کی ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی سے فائدہ اٹھا کر ان سے ایک زرّیں بچھڑے کی پرستش کرا رہا تھا۔ یہ محض ایک شعبدہ بازی یا سحر تھا جس کے زور سے وہ بچھڑا مجسمہ ساختہ ہونے کے باوجود لوگوں سے ہمکلام ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مدت تک اس مجسمۂ شرک کا جادو چلتا رہا لیکن آخر کار خونِ اسرائیل جوش میں آیا، اور حضرت موسےٰؑ نے ایک ہی ضربِ عصا سے سامری کا جادو توڑ دیا۔

ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات ۲۹۷

یہ شعر بھی نظم "خضرِ راہ" میں سے ہے۔ ساحرِ الموط سے مراد ہے حسن بن صباح۔ برگِ حشیش یعنی بھنگ۔ شاخِ نبات یعنی مصری کے کوزے کی تیلیاں۔

الموط یا الموت قزوین اور گیلان کے درمیان ایک مشہور قلعہ کا نام ہے۔ چونکہ حسن بن صباح نے اپنی جنتِ ارضی بنانے اور عوام کو اپنے حلقۂ اثر میں کھینچنے کے لئے الموت ہی کو اپنا مرکز بنایا تھا اور یہ سلسلۂ ضلالت سحر سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ لہٰذا حسن بن صباح کو ساحرِ الموط کہا۔ حسن بن صباح اضلاعِ خراسان کے شہر طوس میں پیدا ہوا۔ یہ شخص تحصیلِ علم کے زمانہ میں چونکہ عمر خیام اور نظام الملک طوسی کا ہم مشرب اور ہم درس رہ چکا تھا، لہٰذا بہت بڑا عالم و فاضل تھا۔ مگر افسوس کہ اس نے اپنے علم و فراست کو خیر کی صورت میں نہیں، بلکہ شر کی

صورت میں استعمال کیا، فریب و خود غرضی کا مسلک اختیار کرکے حکومت و اقتدار کا طالب ہوا، اور عقائدِ اسلامی سے صریح بغاوت کی، لہٰذا اُس کا علم "یار" ہونے کی بجائے "مار" ثابت ہوا:۔

علم را بر دل زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

بہرکیف جس مکر و فریب سے اُس نے اپنے ولی اللہ اور عارفِ کامل ہونے کا سکہ پہلے پہل چند سادہ لوح انسانوں پر بٹھایا، اُس کا قصّہ یوں ہے کہ جب وہ مصر سے ایک جہاز پر سوار ہوا، تو یہ جہاز اتفاقاً طوفانِ باد میں گھر گیا، اور مسافروں کو جان کے لالے پڑ گئے حسن کو فوراً ایک شرارت سوجھی اور جہاز والوں کو یہ کہہ کر اطمینان دلانے لگا "میرے ہم سفر بھائیو! اگرچہ ہمیں طوفان نے آ گھیرا ہے لیکن اس میں غم و تشویش کی کوئی بات نہیں۔ میرے دل میں خدا کی طرف سے القاء ہوا ہے کہ یہ جہاز ہر خطرے سے محفوظ رہ کر صحیح سلامت کنارے پر جا لگے گا" یہ کرامت حسن نے اس بنا پر چھانٹی تھی کہ اگر جہاز سچ مچ غرق ہو گیا تو تمام سامعین بھی لازمی طور پر ہلاک ہوں گے، اور کوئی شخص بھی میری پیش گوئی کو جھٹلانے والا باقی نہیں رہے گا کہ اُس سے خفت ہو۔ بصورت دیگر اگر جہاز بچ گیا تو تمام مسافر نہ صرف خود ہی میرے مستقل مرید ہو جائیں گے، بلکہ ہر ہر شہر میں میری روحانی قوتوں کی تبلیغ و اشاعت بھی کرتے پھریں گے۔ چنانچہ وہ جہاز طوفان سے بچ گیا اور اُس کا دجل و فریب وقتی طور پر کامیاب ہوا۔

بعد ازاں حسن نے عقیدت مندوں کی امداد سے مازندران میں اپنے لئے ایک سلطنت قائم کرنے کا جال بچھایا۔ یہ کوہستانی علاقہ ہے، اور اس میں پہاڑ کی چوٹی پر ایک پرانا قلعہ تھا جسے الموت (عقاب کا آشیانہ) کہتے تھے۔ حسن نے قلعہ پر قابض ہوتے ہی اس میں نہایت خوشنما باغات لگوائے، نہریں بہائیں، اور آرائش و زیبائش کا ہر ممکن سامان مہیا کیا۔ یہ گویا جنت تھی، اور جب جنت تھی تو حوریں کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ ملک کی حسین ترین لڑکیاں اس میں حوروں کے طور پر لائی گئیں بہشت میں زیب و کشش کے تمام سامان مکمل ہو لئے تو حسن کے مرید ہر بستی میں بھیس بدل کر پھر گئے اور لوگوں کو ترغیب دینے لگے کہ آؤ تمہیں دنیا کے اندر بہشت کی سیر کرائیں، چنانچہ بہت سے بھولے شکار ان کے دام تزویر میں پھنس کر قلعہ الموط میں پہنچ جاتے، وہاں داخل ہوتے ہی انہیں برگ حشیش (بھنگ) پلا دی جاتی۔ بعد ازاں بے ہوشی و خود فراموشی کے عالم میں حوران بہشتی انہیں اپنی آغوش لطیف میں سمیٹ لیتیں پس کیف و مستی اور عیش و سرور کا یہ ماحول دیکھ کر ہر شخص وہیں کا ہو رہتا۔ خیام نے تو اپنے اشعار میں مے، معشوق، موسیقی اور لبِ جو کا لفظی نقشہ کھینچا ہے، مگر حسن بن صباح کے یہاں وہ چیزیں حقیقت کی صورت میں دستیاب ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ ہوش ربا ماحول دیکھ کر کسی کو بھی وہاں سے باہر نکلنے کی توفیق نہ ہوتی، اور اس طرح ساحر الموط کے مریدوں (یا بلفظِ دیگر رعایا) میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بہر حال استعارات اور تلمیحات سے قطع نظر مذکورہ شعر میں اقبال مزدور کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ سرمایہ دار (ساحر الموط) نے تیرے حق سے بہت ہی قلیل

اُجرت (برگِ حشیش) دے کر تجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور سچ مچ تو بھی اُس پہ رضامند ہو گیا، اور نشہ آور بھنگ، کو تسلی بخش مزدوری (شاخِ نبات) سمجھ کر اُسے برضا و رغبت قبول کر لیا۔
بالفاظِ دیگر:-

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات!

اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش
اے کہ شناسی خفی را از جلی ہشیار باش
ص ۳۰۲

یہ شعر بھی نظم "خضرِ راہ" میں سے ہے۔ یہاں شرک کی دو اقسام یعنی شرکِ خفی اور شرکِ جلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرقہ بندی اور نفاق کی نہایت مؤثر تردید کی گئی ہے۔ "شرکِ خفی" یہ ہے کہ انسان قانونِ سماوی اور احکامِ الٰہی کا مطیع ہونے کی بجائے محض ہوا و ہوس نفسانی کا غلام ہو۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم میں فرمایا:- أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ۔ یعنی "اے نبیؐ! کیا آپ نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جس نے خواہشاتِ نفسانی ہی کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔" اس بنا پر شرکِ خفی کے عوامل نہایت مبہم و نامعلوم ہیں۔ اکثر لوگ "مسلمان" ہونے کے باوجود "شرکِ خفی" کی گرفت سے محفوظ نہیں اور نفسِ امّارہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوتے ہیں!
علاوہ ازیں شرکِ جلی (ظاہر شرک)، اس سے بھی بڑا ہے۔ مثلاً صریحاً غیر اللہ کی پرستش کی جائے،

اور قوم کے بزرگ انسانوں کی مورتیاں بناکر یا قبور کی صورت میں انہیں اپنا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہوئے اُن کی عبادت کی جائے۔ شرک کی یہ قسم گویا مخلوق پرستی ہے۔ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ مختلف جماعتوں میں جھگڑا اور منافرت پیدا کرے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں، کہ ابوبکرؓ کا پیروکار ہوکر سیدنا علیؓ سے نفرت رکھنا، یا حضرت علیؓ کا عقیدت مند ہوکر صدیقِ اکبرؓ کو بُرا سمجھنا ایک طرح کی بُت پرستی ہے۔ یہ شرکِ جلی سے کسی طرح کم نہیں:-

ہر کہ با زندہ از پیشِ مردہ!
می کند جنگ، سخت نادان است

حاصل یہ کہ فرقہ بندی اور نفاق و نفرت اُس قوم کے شایانِ شان ہرگز نہیں، جس کا خدا بھی ایک ہے، نبیؐ بھی ایک ہے، قرآن بھی ایک ہے، کعبہ بھی ایک ہے اور قومی جھنڈا بھی ایک ہے ــــــــ

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار صفحہ ۲۰۲

اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر
آیۂ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد رکھ! صفحہ ۳۲۲

ان ہر دو اشعار میں اشارہ ہے مندرجہ ذیل آیۂ قرآنی کی جانب :-

رَبَّنَآ اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْہِ ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ٥ (پ ۳ : ع ۹)

ترجمہ :- "اے پروردگار! جس دن کے (یعنی قیامت کے) ظہور پذیر ہونے میں کوئی شک نہیں، اُس دن تو لوگوں کو (جزا و سزا کے لئے) ضرور اکٹھا کریگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی ہرگز نہیں کرتا۔"

اس لحاظ سے ایمان کی بقا سراسر اس چیز پر موقوف ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ کے تمام وعدوں پر کامل اعتماد ہو۔ قرآن حکیم میں مومن سے ایک نہیں، بلکہ سینکڑوں قسم کے وعدے کئے گئے ہیں جس شخص کو ان وعدوں پر سو فی صدی یقین نہ ہو، اُس کے دل میں نہ تو ایمان کی روح پیدا ہو سکتی ہے، نہ سینہ کسی اچھی "آرزو" سے "آباد" ہو سکتا ہے، اور نہ قوتِ عمل پیدا ہو سکتی ہے!

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے ص ۳۰۶

یہ شعر نظم "طلوعِ اسلام" میں سے ہے۔ حضرت علامہ خاص طور پر مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کا دستِ قدرت (قوتِ عامل) اور زبان (ترجمانِ حق) تو ہی ہے۔ سچ پوچھیئے تو شانِ خدائے قدوس کے صحیح "خلیفہ" ہی کی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً "میں زمین میں اپنا خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں" پس مصرعِ اول میں سراسر اشارہ ہے اسی مقامِ خلافت کی جانب جو انسان کو خدا کا "دستِ قدرت" اور "زبان" ہونے کا اہل ثابت کرے!

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے ص ۳۰۶

یہ شعر بھی "طلوعِ اسلام" میں سے ہے۔ فرماتے ہیں کہ مکان (دنیا) بھی فانی ہے، اور مکین (انسان) بھی فانی۔ پھر ازل اور ابد اگر دنیا میں کسی ہستی کا مستقل حق ہے تو فقط مسلمان ہے، کیونکہ ایمان و قرآن کی برکت سے اُس کے سینے میں ایک لازوال نور موجود ہے۔ "تو خدا کا آخری پیغام ہے"۔ یعنی تو دنیا کی آخری اُمت ہے۔ اور خدا کے آخری پیغام (قرآن) کا حامل ہے۔ یہ وہ عدیم النظیر پیغام ہے جسے "اکمل" اور "اتم" ہونے کی شان عطا کی گئی۔

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے صـ ۳۰۷

قرآنِ حکیم فرماتا ہے کہ ابراہیم علیہ السّلام ایک اولوالعزم پیغمبر تھے، موحّدِ اعظم تھے صاحبِ قلبِ سلیم تھے، اور وہ راہِ حق پر گامزن ہو کر کڑی سے کڑی آزمائش میں کامیاب ہوئے۔ اکثر مسلمانوں کا یہ عقیدہ قطعاً غلط ہے کہ اسلام کے بانی مبانی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ از روئے آیاتِ قرآنی یوں تو ہر پیغمبر اسلام ہی کا مبلغ تھا۔ لیکن جس پیغمبر نے ایک ممتاز اور نمایاں طریق پر سب سے پہلے اسلام کی بنیاد انتہائی قوت و سطوت سے رکھی، وہ ابراہیم علیہ السّلام ہیں۔ چنانچہ ذیل کی آیۂ شریفہ اس حقیقت پر شاہد ہے:۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (پ۱۷ : ۱۶ع)

"تمہارا قومی مذہب درحقیقت تمہارے (روحانی) باپ ابراہیم کا مذہب ہے۔ اسی لئے تمہارا نام "مسلمان" رکھ دیا تھا۔"

اسی بنا پر مصرعِ دوم میں فرمایا کہ تیری نسبت ابراہیمی ہے، لہٰذا تو "معمارِ جہاں" ہے۔ "معمار" کے لفظ سے اشارہ کیا ہے اس واقعہ کی جانب کہ ابراہیم علیہ السّلام کے دستِ مبارک نے موجودہ کعبہ کی تعمیر کی تھی، یہ تعمیرِ کعبہ، چونکہ تمام دنیا کے روحانی نظام کی تعمیر تھی ایک مرکزی صورت میں، لہٰذا ابراہیم اور پیروانِ ابراہیم کو "معمارِ جہاں" کا خطاب عطا فرمایا۔ ذیل کی آیۂ شریفہ سے ثابت ہے، کہ ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے بیٹے کی معیت میں بیت اللہ شریف کی بنائیں استوار کی تھیں:۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (پ ۱، ع ۱۵)

ترجمہ: "اور جب ابراہیم اور اسمٰعیل نے باہم مل کر ہمارے گھر (خانۂ کعبہ) کی بنائیں استوار کیں تو انہوں نے حضورِ حق یہ دعا کی کہ پروردگار! ہماری یہ (دینی) (روحانی) خدمت قبول کر۔ تو ہی (دعاؤں کا) سننے والا، اور (حقیقتِ حال کا) جاننے والا ہے"

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے — صفحہ ۱۸۱

مصرعِ اول میں اشارہ ہے لارڈ کچنر کی غرقابی کی طرف، اور مصرعِ دوم میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ گو مہدی سوڈانی جیسے مومن کی خاکِ جسد کو حوالۂ موجِ دریا کر دیا جائے (جیسا کہ کچنر نے کیا)، تاہم اُس کی روحِ عمل اور پیغامِ حیات ہزاروں گہرِ آبدار (مردانِ غازی) کی صورت میں جلوہ پیرا ہوتی ہے!

مہدی کا اصل نام محمد احمد تھا۔ بارہ برس کی عمر میں قرآنِ مجید حفظ کر لیا تھا۔ وہ چونکہ حافظِ قرآن ہی نہیں تھے بلکہ عاملِ قرآن بھی تھے۔ اور اس کتابِ مقدس کی روح تک رسائی حاصل کی تھی، لہٰذا اُن کی صحیح امامت و قیادت سے متاثر ہو کر ہزاروں لوگ اُن کے مرید بن گئے تھے۔ پیر اور مرید یکساں طور پر سادہ، بے ریا، مخلص مبلغِ حق اور سرفروش مجاہدین واقع ہوئے تھے۔ بالفاظِ دیگر وہ

اسوۂ صحابہؓ کا بہترین نمونہ تھے۔ حضرت مہدی کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز چونکہ سوڈان تھا، لہٰذا سوڈانی کہلاتے تھے۔

چونکہ حضرت مہدی نے جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلے میں بہت سے دشمنانِ اسلام کو نیست و نابود کیا تھا۔ اس لئے لارڈ کچنر نے فتح سوڈان کے بعد اپنے جذبات بغض و طاغوتی کے تحت اس قدر ذلیل و خبیث حرکت روا رکھی کہ حضرت مہدی کی قبر کو کھدوا کر نعش برآمد کی اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریائے نیل میں پھینکوا دیا۔ چنانچہ خدائے غیور کی شانِ غیرت دیکھئے کہ وہی کچنر ۱۹۱۸ء میں سفارت روس پر جاتے ہوئے طوفان میں گھرا اور بحالم بےکسی مثلِ فرعون موجوں کی زد میں دم توڑ دیا۔ اس لحاظ سے گویا "زیر دریا" تیرنے کی سائنس ایجاد کرنے والے قہرِ الٰہی کے سامنے عاجز و بےبس ہو کر لقمۂ اجل بنے۔

اسی بناپر "جاوید نامہ" میں بھی روحِ مہدی شقی ازلی کچنر سے کہتی ہے:-

گفت اے کشنر اگر داری نظر
انتقامِ خاکِ درویشے نگر
آسماں خاکِ ترا گورے نداد
مرقدے جز در یمِ شورے نداد

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
صـ ۲۱۸ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

جونہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہوش سنبھالا، اور کائنات کا ایک گہرا مطالعہ کرنے کے بعد، "مخلوق خداوندوں" سے متنفر ہو کر خالق سے رشتۂ وحدت جوڑا، کفارِ وقت کو معنی توحید سمجھانے میں کسی خوف وہراس، کسی رورعایت اور کسی مصلحتِ وقتی کا لحاظ ہرگز نہیں رکھا خلیل اللہ نے مشرکین سے صریحاً کہہ دیا کہ اُن معبودوں اور دیوتاؤں کی پرستش مت کرو، جن کے مجسمے تم نے اپنے ہاتھ سے بنائے ہیں۔ اور جو کسی جہت سے بھی تمہارے نفع و نقصان کے مختار نہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کا پیغام توحید سنکر نہ صرف عوام اُن کے دشمن ہو گئے بلکہ خود والد یعنی آذر نے بھی قطع تعلق کی ٹھان لی، اور کہا کہ اگر تو ہمارے دیوتاؤں کی یوں ہی توہین کرتا رہا تو میں تجھے نہایت خوفناک سزائیں دوں گا۔ مگر عاشقانِ حق نے تبلیغ توحید میں آج تک کسی تخویف و تہدید کی پرواہی کب کی ہے۔ بقول اقبالؒ :-

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اپنے والد اور کفارِ وقت سے صاف صاف کہہ دیا کہ دنیا کی کوئی تکلیف مجھے اعلانِ توحید سے باز نہیں رکھ سکتی۔ بعد ازاں جب کفار ایک بہت بڑے سالانہ میلے پر جانے لگے تو حضرت ابراہیم کو بھی ساتھ لے جانا چاہا، انھوں نے فرمایا میں بیمار ہوں! یہ غلط بیانی نہیں تھی، بلکہ بطور استعارہ مقصد یہ تھا کہ میں یہ طوفانِ شرک دیکھ کر روحانی طور پر بیمار ہوں، اور تمہاری عدم موجودگی میں اس بیماری کا خاطر خواہ علاج بھی کروں گا۔ اور فی الواقعہ اُن کے

چلے جانے پر انہوں نے اپنے دردوں کا بہترین علاج یہ کیا کہ ایک کلہاڑا لے کر صنم خانۂ آذری کے تمام بت توڑ دیئے، اور کلہاڑا سب سے بڑے بت کے کاندھے پر رکھ دیا، کفار جب واپس آئے اور یہ منظر دیکھا تو نہایت غضب ناک ہوتے حضرت ابراہیمؑ سے دریافت کیا، یہ ستم کس نے کیا ہے کہ ہمارے دیوتاؤں کے سر تن سے جدا کر دیئے؟ آپ نے جواباً فرمایا، "جو تمہارا سب سے بڑا معبود ہے، جو ان کا نگہبان تھا، اور جس کے کاندھے پر اس وقت کلہاڑا ہے، اس سے پوچھو کہ بت کس نے توڑے ہے!"

الغرض مشرکین یہ جواب سُن کر ایسے شرمندہ و لاجواب ہوئے کہ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلا۔ چونکہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ کام یقیناً ابراہیمؑ کا ہے، لہٰذا ان کے لئے کم از کم یہ سزا تجویز ہوئی کہ انہیں ایک وزخ نما گڑھے میں پھینک کر راکھ کر دیا جائے۔ یہ آتش کدہ فوراً تیار کیا گیا اور شہر میں بطورِ عبرت یہ منادی کی گئی کہ سب لوگ ابراہیمؑ کی سزا یابی کا تماشا دیکھنے آئیں۔ وقتِ معین پر نمرود بھی انتہائی ترک و احتشام سے اپنے تخت پر متمکن ہوا، اور رعایا بھی تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوئی۔ ایک روایت میں ہے کہ اس نازک موقع پر جبریل نے آ کر حضرت ابراہیمؑ کے حضور اپنی امداد و اعانت پیش کی۔ آپ نے فرمایا "خالقِ موجودات میرے حال کو جانتا ہے اور اسی کی وحدانیت کے لئے میں یہ قربانیاں پیش کر رہا ہوں۔ مجھے مخلوق میں سے کسی کا سہارا نہیں چاہیئے!"

چنانچہ جونہی خلیل اللہ نے آتشِ نمرود میں چھلانگ لگائی، فوراً حکمِ الٰہی صادر ہوا:۔

قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ ہ (پ ۱۷: ۴ ع) ترجمہ :- ہم نے حکم دیا کہ اے آگ ! ابراہیمؑ پر صحت و سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا !"

پس آگ اپنی خوئے التہاب چھوڑ کر سرد ہوگئی، اور حضرت ابراہیمؑ کو کوئی گزند نہ پہنچا! کفار چونکہ عشق (ایمان و یقین) کی نعمت سے محروم تھے، اور نورِ باطن سے بے بہرہ، لہٰذا وہ عقل (یعنی محض اسباب و علل، منطقی استدلال، اور رسمی اندازِ فہم و شعور) کے تحت اس متضاد اور مافوق العادت صورتِ حالات کو دیکھ کر تصویرِ حیرت بن گئے۔ اِسی بنا پر دوسری جگہ فرمایا کہ :-

عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب

"محوِ تماشائے لبِ بام" کی توجیہہ یہ ہے کہ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی "لبِ بام" الگ بیٹھی ہوئی یہ تماشا دیکھنے کی منتظر تھیں۔ اُن کی عقل تمام تر بن اس معجزہ کی قوتِ تسخیر کا اندازہ کرنے سے قاصر رہی۔ حاصلِ بحث بہرکیف یہ ہے کہ :-

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی ص ۳۰۸

اس شعر میں اشارہ ہے آنحضرتؐ کے معراج کی جانب۔ شبِ معراج آنحضورؐ بستر پہ آرام فرما

تھے کہ یکایک حضرت جبریلؑ "قاصد" نمودار ہوئے، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر حضور سے ملاقی ہوگا، اور میں سواری لایا ہوں۔ چنانچہ یہ "فرمودۂ قاصد" سُنکر عشق رسولؐ نے کوئی ایسا سوال نہیں اُٹھایا کہ یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے، اور ایک رات میں ہفت افلاک کی سیر کس طرح ہوگی، بلکہ فوراً "سبک گام عمل" ہوئے، اور "مسجدِ حرام" (کعبہ) سے مسجدِ اقصےٰ (بیت المقدس) تشریف لے گئے۔ جملہ انبیاء کی امامت اختیار کرتے ہوئے نماز پڑھائی، اور پھر براق پر سوئے عرشِ معلےٰ تشریف لے گئے۔ چنانچہ بقول اقبالؔ اس کی بہترین حکمت یہ قرار پائی کہ:-

راہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مُسلمان سے معراج کی رات

بہرکیف آنحضرتؐ نے معراج سے واپس تشریف لاکر ہفت افلاک کے جو واقعات بیان کئے، کفّار نے نہ صرف اُن سے انکار کیا بلکہ ہر جگہ اور ہر مجلس میں معراج کی تضحیک بھی کی۔ وہ آنحضرتؐ کے اس آغازِ بیان ہی کے قطعی منکر تھے کہ "گذشتہ رات جبریل میرے پاس آیا، اور اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام لایا کہ مجھے وہ معراج حاصل ہوگا۔ جو اس سے پہلے کسی اور نبی کو حاصل نہیں ہُوا۔"

کفّار عقلی طور پر معراج کو ناممکن ہی نہیں، بلکہ محال قرار دیتے ہوئے اس کے قائل کو "مجنون" کا خطاب دیتے تھے۔ لہٰذا لازمی طور پر "پیغامِ معراج" کے بھی منکر تھے پس شعر کا مفہوم اب واضح ہے کہ:-

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل | عقل سمجھی ہی نہیں معنئ پیغام ابھی

اس شعر میں لفظِ عشق بمعنی "مومن" اور لفظِ عقل بمعنی "کافر" مستعمل ہوا ہے!

کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ "یَنْسِلُوْنَ"

مکمل آیۂ شریفہ یوں ہے:۔

وَفُتِحَتْ يَاجُوجُ وَمَاجُوجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ (پ۱۷ : ع۷)

ترجمہ:۔ "یاجوج و ماجوج کے لشکر کھل جائیں گے، جو ہر بلندی سے نکلتے ہوئے دکھائی دیں گے۔"

یاجوج اور ماجوج حسبِ روایت دو مفسد قومیں ہیں جو قربِ قیامت میں تمام قلعہ بندیاں اور دیواریں وغیرہ توڑ کر تمام روئے زمین پر فتنہ و فساد پھیلائیں گی، اور انسانیت پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گی۔ ان کے خروج کو من جملہ آثارِ قیامت اور عذابِ الٰہی شمار کیا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں مذکور ہے کہ ذوالقرنین نے ایک مدتِ معیّن تک نوعِ انسانی کو یاجوج و ماجوج کے فتنے سے بچانے کے لئے لوہے اور دھاتوں سے کئی سو میل لمبی دیوار بنائی جو آج دیوارِ چین کے نام سے مشہور ہے!

یہاں یاجوج اور ماجوج سے علامہ اقبالؒ کی مراد ہے سرمایہ دار اور مزدور کا وہ تصادم جو عہدِ حاضر میں روز بروز تیز تر ہوتا جا رہا ہے، اور جس کی روک تھام کسی فلسفہ اور کسی تدبر و حکمت سے ممکن نہیں ہے۔

تدبیر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

حکمِ حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار ص ۳۳۵

مصرعِ اوّل میں سورۃ النجم کی آیۂ قرآنی موجود ہے اور اس کا ترجمہ ہے "ہر انسان کو وہی کچھ ملتا ہے، جسے وہ اپنی محنت و کوشش سے حاصل کرے۔ (پ ۲۷: ع ۶)

اس بنا پر حکیمانہ اور شرعی استدلال کیا ہے کہ مزدور کی محنت و کاوش کا جو منافع ہے اُسے سرمایہ دار کیوں بلا شرکتِ غیرے ہضم کر جاتا ہے، اور مزدور کو اس کا مکمل اور تسلّی بخش حق کیوں نہیں دیا جاتا۔ حق تو کیا، طرزِ سلوک میں بھی حالت اس حد تک عبرتناک ہے کہ:-

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا!

یوں تو رسول اللہ صلعم کے ہر صحابی کو صحرائے عرب کا شیر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں اس

خطاب کا اطلاق خصوصاً حضرت خالد بن ولید پر ہوتا ہے، جنہوں نے عہدِ ابوبکر صدیق میں اصحابؓ کی ایک مٹھی بھر جماعت کے ساتھ "گریٹ رومن امپائر" پر حملہ کیا اور معجز نما طریق پر فتح یاب ہوئے۔ روما قدیم رومن سلطنت کا دار الخلافہ تھا، اور یہاں کے باشندے اس قدر قوی ہیکل اور نشۂ قوت میں اس قدر خراب و سرمست تھے کہ شیروں سے بلّی کی مانند کھیلا کرتے تھے، اور بے بس غلاموں کو بھوکے درندوں کے سامنے پھینک کر تماشا دیکھنا اُن کا سامانِ تفریح تھا۔ آخر کار خدائے قہار کی غیرت نے ایک ایسا شیرِ عرب اُن کے سامنے لا کھڑا کیا، جس کی سطوت و ہیبت سے وہ مثلِ شغال بھاگ نکلے، اور اس قانونِ قدرت کی عملی طور پر تصدیق ہوئی کہ :۔ "ہر فرعونے را موسےٰ" !

مصرعِ دوم میں علامہ مرحوم مسلمان قوم کو بشارت دیتے ہوئے اُس کی ہمّت افزائی فرماتے ہیں کہ رحمتِ حق سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ یقین ہے کہ اسلام کی شان و شوکتِ رفتہ دوبارہ عود کر آئے گی، اور ملّت کی روحِ خفتہ از سرِ نو بیدار ہو کر قوم کے ادبار کو آزادی و خوشحالی میں تبدیل کر دے گی :۔

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں !

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے ۲۳۰

جس قوم کو دنیا "تاتاری" کے نام سے یاد کرتی ہے، وہ قوم مذہب و مسلک اور فکر و عمل کے تین مختلف ادوار سے گذری ہے (۱) پہلا دَور وہ ہے جبکہ اس قوم کا مشغلہ محض قتل و غارتگری اور لوٹ مار تھا۔ اس اسٹیج پر ان کی حیثیت قزاقوں سے زیادہ نہ تھی۔ (۲) پھر دوسرے دَور میں یہ لوگ امیر تیمور کی قیادت و امارت میں وسط ایشیا میں مقیم ہوئے اور "ترک" کا خطاب پایا۔ (۳) پھر تیسرے دَور میں یہ قوم "مغل" کے نام سے مشہور ہوئی۔ آخر کار سولھویں سترھویں صدی میں ان لوگوں نے انسانی تہذیب و اخلاق کی قدر و قیمت کو ایک حد تک پہچانا۔ اور انسانی برادری میں ایک خاص تمدّن کے علمبردار ہوئے۔

اپنے دَورِ وحشت و بربریت میں یہی تاتاری تھے جن کے ہاتھوں خلافت عباسیہ برباد ہوئی اور بغداد جیسے عظیم الشان اسلامی اور علمی مرکز بھی کھنڈرات بن گئے لیکن بعد میں جب اسی قوم نے اسلام قبول کیا اور "ترک" کے نام سے ٹرکی کے نیم مُردہ جسم میں غیرت و حریتِ اسلامی کی روحِ تازہ پھونکی، تو ان کے ہاتھوں ایسے ایسے تعمیری کام بھی ہوئے کہ اُن کے تخریبی اعمال کی تلافی ہوگئی۔ انہیں ترکوں نے اپنے عہدِ حکومت میں حرمین شریفین کے تقدّس کا اندازہ کرتے ہوئے اُن کی پاسبانی کا حق بھی ادا کیا۔ کہاں تاریخ کی وہ یورشِ تاتار اور اُس کی خوفناک تباہی و بربادی، اور کہاں حفظِ اسلام اور پاسبانیٔ حرم کا یہ مقدّس کام! پس اسی بنا پر

فرمایا کہ :-

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوّتِ حیدری ۲۸۴

حیدر اور اسد اللہ حضرت علیؓ کے القاب تھے۔ بے مثل جرأت و ہمت کی بنا پر آپ کو "جوانوں میں یکتا جوان" اور آپ کی تلوار کو "عدیم النظیر تلوار" کہا گیا ہے۔ کفّار کے مقابلے میں شیرِ خدا کی فتوحات بے شمار ہیں۔ جو تاریخ اسلام کے صفحات میں بکھری پڑی ہیں۔ عرب کے دو مشہور پہلوان مرحب اور عنتر بھی آپ ہی نے زیر کئے تھے، اور خیبر کی تسخیر کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہے۔ بایں ہمہ یہ فوق العادت جرأت و ہمت اور قوتِ تسخیر مکلّف و مرغّن غذاؤں کی رہینِ منّت نہ تھی بلکہ ثمرہ تھی ایمان و یقین کی اس برقی قوت کا جو آپ کے ہر رگ و ریشہ میں سمارہی تھی۔ آپ فقط جَو کی روکھی پھیکی روٹی زیادہ سے زیادہ روغنِ زیتون یا کھجور سے کھا لیا کرتے تھے اگر لوبتِ جنگ شکست دیتے تھے اُن پیل تن پہلوانوں کو جن کا مشغلہ شب و روز اعلیٰ خورد و نوش، عیش و نشاط، شکم پرستی اور فنونِ حرب و ضرب کی مسلسل مشق تھا۔

اسی بنا پر علّامہ مرحوم ہر مسلمان کو یہ تلقین فرمارہے ہیں کہ وہ فقر و غنا (غریبی و امیری) کی بحث سے بلند تر رہ کر ادج و اقبال اور غلبہ و حکومت کے حقیقی ذریعہ پر نظر رکھے، اور وہ ہے ایمان

بالحق اور عشقِ رسول!

جب نظر سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی!
کھلتے ہیں غلاموں پہ اسرارِ شہنشاہی!

اور اسی مفہوم و مقصد کے تحت ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:-

سبب کچھ اور ہے جس کو تو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اب "سببِ زوال" کی بہ نظرِ انصاف تحقیق کیجیے تو وہ بالفاظِ مختصر یہ ہے: تعلیماتِ قرآن کی پیروی اور کامل یقین و ایمان سے محرومی۔ رسول کریمؐ کے "اسوۂ حسنہ" سے غفلت و احتراز!

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

اس شعر میں "پیرِ حرم" سے مراد ہے شریفِ مکہ۔ اسی طرح جوانانِ تتاری سے مراد ہیں ترک! شریفِ مکہ اگرچہ سرزمین حجاز کا حکمران تھا۔ اور حرمین شریفین کی خدمت و حفاظت کے فرائض اس نے اپنے ذمے لے رکھے تھے، تاہم وہ غدار و بددیانت ثابت ہوا۔ اس کی سازشوں سے عرب میں بغاوت ہوئی اور عرب کے تمام ساحلی علاقے جو اس وقت تک ترکوں کے قبضے میں تھے اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ گویا پیرِ حرم کی نفس پرستی اور کوتاہ نظری سے حرمین شریفین کو

توہین کے جو خدشات تھے، وہ ترکانِ عثمانی نے بحدِ امکان رفع کر دیئے۔ وہ ہر ممکن طریق پر بیت اللہ شریف کی خدمت کرتے رہے!

اُمت کا بد عمل ہو کر "باعثِ رسوائی پیغمبرؐ" ہونا اور پیرِ حرم کا غلامِ نفس بن کر وجہِ بد نامیٔ حرم ہونا مبنی قرینِ حقیقت ہے!

کیا خوب امیرِ فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا!
تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا ۳۳۶

امیر فیصل مکہ معظمہ کے والی شریف حسین کا بیٹا تھا۔ عربوں میں ترکوں کے خلاف بغاوت میں یہ باغیوں کا دستِ راست رہا۔ اور ترکوں کو شکست دینے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ وہ نام و نسب کے لحاظ سے اگرچہ حجازی تھا، لیکن اپنے مسلکِ غداری و مسلم آزاری کی وجہ سے روایتی طور پر "حجازی" کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں تھا۔ سنوسی ایک بزرگ تھے۔ جنہوں نے افریقہ میں فرقہ سنوسیہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس فرقہ کی مجاہدانہ اور انقلابی سرگرمیاں اس حد تک بڑھیں، کہ فرانسیسی اور برطانوی حکومت کو اُن کی جانب سے اعلانِ جہاد کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسی سنوسی نے امیر فیصل کو پیغام بھیجا تھا کہ غیرتِ اسلامی سے کام لے اپنی نسلی اور روایتی غداری کو دیکھ، دِل کا حجازی بن، اور مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کو اپنی غداری و نفس پرستی سے صدمہ نہ پہنچا

مسجد تو بنا دی دم بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں سے نمازی بن نہ سکا ص ۳۲۶

کسی زمانہ میں شاہ عالمی دروازہ لاہور کے باہر مسلمانوں نے ایک مسجد بنانا چاہی۔ زمین متنازعہ تھی اور اہل ہنود سے اُس کے متعلق جھگڑا تھا۔ چنانچہ بُت پرستوں کی ضد میں جوشِ ایمانی یہاں تک تیز ہوا کہ ہر مسلمان معمار اور مزدور کے طور پر ڈٹ گیا اور رات ہی رات میں مسجد کھڑی کر دی۔ اِسی بنا پر فرمایا کہ مسجد تو ایک ہی رات میں مکمل کر دی گئی لیکن خود مسجد بنانے والے برسوں میں بھی نمازی نہ بن سکے۔ اس صداقت پر بیرون شاہ عالمی دروازہ کی مسجد ہی نہیں، بلکہ تقریباً ہر مسجد شاہد ہے کہ مسلمان کا ذوقِ سجدہ ریزی و توحید پرستی سرد ہو چکا ہے۔ ہر شہر میں بلحاظ تعداد مساجد بے شمار ہیں، لیکن اوقاتِ نماز میں نمازیوں کی جستجو کرو تو مایوسی ہوگی۔ محلّے کے دو چار ناکارہ اور لبِ گور بڈھے، دو تین بیمار جنہیں زندگی پر کوئی اعتماد نہ رہا ہو، اور کچھ غریب و قلاّش جو بے روزگاری کے ستائے ہوئے خدا سے بذریعہ دُعا اپنی مشکل آسان کرانے آگئے ہوں، ہر مسجد کی مجموعی کائنات ہے جس میں، جوشِ عمل، جذبۂ فتح و کامرانی اور فرحت و انبساط کے کوئی آثار نہیں۔ بہر کیف نوجوان، خوش حال اور کھاتے پیتے طبقے کا کوئی فرد آپ کو مسجد میں دکھائی نہیں دے گا، حالانکہ شکرِ نعمت اور ادائے فرض فارغ البال لوگوں پر زیادہ واجب ہے ایسا ماحول دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ گویا صحت و دولت رکھنے والا طبقہ اور مسجد و نماز دو متضاد چیزیں ہیں۔ اسی بنا پر حضرت اکبر الٰہ آبادی نے بطورِ طنز فرمایا ہے:۔

آج بنگلہ میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں
جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

قرآنِ حکیم نے فرمایا ہے کہ "مسجدیں اس لئے تعمیر کی جاتی ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کا نام بلند ہو اور ذکرِ الٰہی بکثرت کیا جاوے" اور یہاں کیفیت یہ ہے کہ انسان ذاکرین اور عابدین تو دکھائی نہیں دیتے، البتہ کبوتر چھتوں اور طاقوں میں نہ صرف ذکر ہی کرتے ہیں، بلکہ اپنی نسل بھی تیزی سے بڑھاتے رہتے ہیں۔

اقبالؒ نے اسی افسوسناک حالت کا تذکرہ "جوابِ شکوہ" میں بھی کیا ہے:۔

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

بالِ جبریل

"بالِ جبریل" کے اشارات

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں
صٓ ۹

اِس شعر میں اللہ تعالےٰ سے خطاب کیا جا رہا ہے، اور "مجھ کو بھی فاش کر دیا" میں اشارہ پایا جاتا ہے "تخلیقِ آدم" کی طرف۔ قرآنِ حکیم میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے آسمان و زمین اور اُن کی جملہ کائنات پیدا کر لی تو اُسے زمین میں اپنا ایک خلیفہ (نائب) پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اُس نے حضرتِ آدم کو زمین پر اُتارا، اور اُن کی نسل کو روئے زمین پہ پھیلایا۔ پس حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ "میں" یعنی انسان ہی تو سینۂ کائنات میں ایک بہت بڑا راز تھا، تو نے مجھے فاش کر کے (یعنی پیدا کر کے) جملہ کائنات کو ہیچ پوچ ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ جس سینے سے راز نکل جائے اُس سینے کو عموماً تہی اور ناکارہ سمجھا جاتا ہے جیساکہ کسی کا شعر ہے:۔

بشر رازِ دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے
نکل جاتی ہے جب خوشبو تو گُل بیکار ہوتا ہے

بہرکیف حاصلِ شعر یہ ہے کہ جُملہ کائنات کی روحِ رواں میں ہوں، مقصدِ تخلیق میں ہوں، اور باقی تمام چیزیں میری عظمت و سطوت کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ یہی مقصد بالفاظِ دیگر یوں بیان ہوا ہے۔

بزمِ ہستی! اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو
تُو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہُوں میں!

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا وہ راز داں تیرا ہے یا میرا

"اُسے" یعنی ابلیس کو جب اللہ تعالےٰ نے ملائکہ کو پیشِ آدم سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ابلیس کے علاوہ سب نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے ابلیس سے عدول حکمی اور سرکشی کی وجہ پوچھی۔ اُس نے کہا۔ تو نے مجھے تو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو خاک سے پھر ایک اعلیٰ چیز (آگ) اپنی ادنیٰ چیز (خاک[1]) کے سامنے سجدہ کیوں کرے؟ یہاں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ

---

[1] یہاں اس طویل بحث کو چھیڑنے کی گنجائش نہیں کہ اپنے فوائد اور اثرات کے لحاظ سے آگ افضل ہے یا خاک؟ مفسرین نے بہ دلائلِ شرعی و عقلی مٹی ہی کو ہر جہت سے ایک ممتاز اور مخزنِ حیات شئے بتلایا ہے۔

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ ہ یعنی "ابلیس نے تعمیلِ حکم سے انکار کیا اور اپنے تکبر کی وجہ سے کافر ہوگیا"

انکارِ ابلیس کے اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ "یا الٰہی! یہ چیز میری عقلِ کوتاہ اندیش سے بالاتر ہے کہ شیطان کو روز ازل تیرے حکم سے انکار کی جرأت کیونکر ہوئی، حالانکہ وہ رازداں میرا نہیں بلکہ تیرا تھا۔ تیری مشیئت اور تیرا ہمہ گیر علم ہی تخلیقِ آدم اور انکارِ ابلیس کی حکمت و ماہیت کا احاطہ کرسکتا ہے۔ تیرے حسبِ ارشاد ہمارا علم "قلیل" اور ہماری دلیل محض "جدل" ہے!

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں\
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اس شعر میں اشارہ ہے "ہبوطِ آدم" کی جانب۔ جب آدم و حوّا نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لیا اُن میں جذباتِ بہیمہ کا ظہور ہوا، اور اُن کی "پوشیدہ" چیزیں اُن پر ظاہر ہونے لگیں، تو وہ بہشت جیسی صاف و پاک جگہ میں رہنے کے اہل نہ رہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے انہیں اُن کے اعمالِ مخصوصہ اور اجرائے نسل وغیرہ کے لئے زمین پر اُتر جانے کا حکم دیا:-

قُلْنَا اھْبِطُوْا مِنْھَا جَمِیْعًاج فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (پ: ۳ع ۴)

ترجمہ: "ہم نے انہیں حکم دیا کہ سب کے سب یہاں سے (باغِ بہشت سے) نیچے اُتر جاؤ۔ جب کبھی میری ہدایت (کتاب اللہ یا پیغمبر)

تم تک آتے اور جو لوگ بھی اُس ہدایت کی پیروی کریں، انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا، اور نہ کسی قسم کا غم۔

پس اقبالؔ وفورِ عشقِ الٰہی میں بڑے ناز کے ساتھ کہتا ہے کہ مجھے باغِ بہشت سے نکل جانے کا حکم دیا ہی کیوں تھا، اور اگر یہ حکم دیا تھا، تو اپنے عاشق کا ایک نامعلوم عرصہ تک انتظار رہنا ہوگا، کیونکہ کارِ جہاں بہت دراز ہے اور ابنِ آدم حق و باطل اور خیر و شر کی اس طویل جنگ سے جلد خلاصی نہیں پا سکتا۔

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد ص۱۰

یہ شعر گویا مندرجہ بالا مضمون ہی کا تتمہ ہے کہ جب آدم زمین پر اُتر چکا تو وہ محض "فراقِ بہشت" کی حسرت کو تسکین دینے کے لئے اللہ تعالےٰ سے کہتا ہے کہ میں شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لینے کا قصور وار ہی سہی، اور پھر تیرے حکم کے تحت جلاوطن ہو کر "غریب الدیار" (مسافر بے نوا) بھی سہی، لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ تیرے جس خرابہ (دُنیائے فانی) کو فرشتے آباد نہ کر سکے، اُسے میں نے اپنی ہمت، دلیری، خطر پسندی اور جفا طلبی کی بنا پر آباد و پُر رونق بنا یا چنانچہ ایک اور شعر میں فرمایا :-

مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے وہ دشت سادہ وہ تیرا جہان بے بنیاد

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی ص۱۷

جس غزل کا یہ مطلع ہے، اُس میں اوّل تا آخر "ساقی" سے مراد ہے آنحضرتؐ کی ذات والا صفات، اسی طرح "بادہ" سے مراد ہے "مئے توحید و معرفت" اور "جام" سے مقصود ہے مومن کا "جامِ دل" جس میں آنحضورؐ نے توحید اور عشقِ حق کی ایسی شراب ڈالی جس کا سرمدی نشہ تا قیامت نہیں اتر سکتا۔

گو بادہ و جام جیسے الفاظ مقدس مضامین میں قدرے کھٹکتے ہیں، تاہم بیشتر شعراء انہیں بطور استعارہ بھی استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ جیسا کہ غالب نے کہا:-

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بایں ہمہ راقم الحروف کے نزدیک احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ حرام چیزوں کے اسماء اور متعلقات شرعی اور دینی مسائل کی ترجمانی میں استعمال نہ کئے جائیں۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی ص۲۱

اس شعر میں "آدابِ فرزندی" سے اشارہ کیا جا رہا ہے اسمٰعیل علیہ السلام نے اُن عدیم النظیر اعمالِ اطاعت و انقیاد کی جانب جو اُن سے اپنے والد محترم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

احکام و ارشادات کی تعمیل میں بہا ظہور پذیر ہوتے کئی مرتبہ اللہ تعالے نے کو حضرت ابراہیم کا امتحان عشق مقصود ہوتا اور وہ بطورِ آزمائش ایسے احکام نازل فرما تا جن کی پیروی غیر محدود و عمیق استقلال عزم و ہمت اور ایثار و قربانی کی خواستگار ہوتی۔ چنانچہ قرآن حکیم شاہد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اُن تمام امتحانات میں باحسن وجوہ کامیاب ثابت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقام خاص پر انہیں "خلیل اللہ" کا برگزیدہ خطاب عطا فرمایا، اور جب وہ اس دارِ فنا سے دارِ بقا کی جانب تشریف لے گئے، تو بالفاظِ قرآن "قلبِ سلیم" جیسا تحفۂ عظیم دربارِ خداوندی میں پیش کیا۔

منجملہ اُن امتحانات کے ایک امتحان "ذبحِ عظیم" کا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک صبح حضرت ابراہیمؑ بستر سے اُٹھے تو نہایت مغموم اور پژمردہ سے تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ نے باپ کی صورت دیکھی تو اُداسی کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے فرمایا: "بیٹا! تین رات سے مسلسل یہ خواب دیکھ رہا ہوں کہ میں تجھے اپنے ہاتھ سے ذبح کرتا ہوں، مجھے جو محبت تجھ سے ہے اُس کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں ایسا خواب تیرے سامنے بیان نہ کرتا، لیکن ایک پیغمبر ہونے کی حیثیت میں اس کی تکرار ظاہر کرتی ہے کہ یہ محض خواب ہی نہیں بلکہ حکمِ الٰہی ہے۔ بتا اب تیری مرضی کیا ہے؟ تو اس حکم کی تعمیل کے لئے خود کو آمادہ پاتا ہے یا نہیں؟" جس بیٹے نے ابراہیمؑ جیسے باپ کا "فیضانِ نظر" پایا تھا، اور "آدابِ فرزندی" سے بہ نورِ شریعت واقف و باخبر تھا، اُس نے فوراً جواب دیا۔ "ابّا جان! آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آیا ہے آپ فوراً اُس کی تعمیل کریں، آپ بفضلِ خدا

مجھے نہایت صابر پائیں گے، اور میں سر عطا کرنے والے کی رضا میں اپنا سر کٹانے سے قطعاً دریغ نہیں کروں گا"۔

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے رسی لی، چھری لی اور بیٹے کے ہمراہ جنگل کو روانہ ہو گئے، ایک درخت کے نیچے اُس لاثانی باپ نے اپنے لاثانی بیٹے کو پیشانی کے بل اوندھا لٹایا، اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھری رواں کر دی۔ معاً جبریل نے حضرت اسمٰعیلؑ کو کھینچکر وہاں دُنبہ رکھ دیا۔ اُدھر عرشِ الٰہی سے آواز آئی " اے ابراہیمؑ! تو نے خواب سچا کر دکھایا، اور ایک بہت بڑی آزمائش میں کامیاب ہوا۔ ہم تیری اور تیرے ہونہار بیٹے کی اطاعت کا انعام یہ دیتے ہیں کہ تاقیامت اِس ذبحِ عظیم کی یاد ہر سال زندہ کی جائے گی"!

یاد رہے کہ " آدابِ فرزندی" کا حق بجا لانے والا یہی بیٹا تھا جس نے آگے چل کر حضرت ابراہیمؑ کے دوش بدوش خانۂ کعبہ کی تعمیر کی، اور ایمان و تقویٰ کا وہ بے مثال مرکز تیار کیا، جسے وقت کا کوئی انقلاب فنا نہیں کر سکتا"!

اطاعتِ حق، اطاعتِ پدر، اور " آدابِ فرزندی" کے ان زریں واقعات کو ملاحظہ فرما لینے کے بعد بقولِ اقبالؔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسمٰعیلؑ کی یہ صفات انہیں محض کسی مدرسہ یا دارالعلوم سے حاصل ہوئیں، یا کسی روحانی بزرگ کے فیضِ نظر سے؟ اقبالؔ کے عندیہ میں جواب یہ ہے کہ انہیں تمام سعادتیں فیضِ نظر سے حاصل ہوئیں۔

علامہ اقبالؔ نے اپنی تمام تصنیفات میں متعدد جگہ محض " مکتب " (جس سے اُنکی مراد ہمیشہ

کالج ہوا کرتا ہے) کی تعلیم کو نوجوانوں کی روحانی اور اخلاقی موت قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو علم، جو بصیرت، جو آداب و اخلاق، جو حسنِ سیرت، اور جو معراجِ انسانی ایک شخص بزرگوں کی مجلس اور اہل اللہ کے فیضِ نظر سے حاصل کر سکتا ہے، وہ دُنیا کے کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ :-

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

پس اسمٰعیل جیسے بندۂ حق فرزند میں جرأت و ہمت اور ایثار و قربانی کی جو قابلِ رشک صفات پیدا ہوئیں، وہ کسی کالج یا یونیورسٹی کے نصابِ تعلیم کا نتیجہ نہیں تھیں۔ بلکہ ایک روحانی بزرگ (ابراہیم علیہ السلام) کے فیضِ نظر کا ثمرہ تھا! اس بنا پر حاصل بحث یہ ہوا کہ انسان کو روحانی، اخلاقی اور علمی فروغ رسمی سکولوں اور کالجوں سے ہرگز نہیں مل سکتا، بلکہ اس کی تحصیل کے لئے اہل اللہ کی مجلس اور اُن کے حلقۂ درس و ارشاد کا التزام ہونا چاہیئے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں اقبال ایسے مخلص اہل اللہ کی کرامتیں بیان کرتا ہے، جن میں مبالغہ نہیں، محض حسنِ عقیدت نہیں، بلکہ جلوۂ حقیقت نمایاں ہے :-

۵

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں گویا آستینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کُشتہ کو موجِ نفس اِن کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
تمنّا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لَا یَحْزَنُوْن کر
خرد کی گتھیاں سلجھا رہا ہوں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

ص ۲۴

مصرعِ دوم میں اشارہ ہے اِس آیۂ قرآنی کی طرف:۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (پارہ ۱۱ ع)

ترجمہ: "یاد رکھو کہ اللہ کے سچے دوست فقط وہی لوگ ہیں جن کے دل و دماغ پر خوف اور غم کا کبھی تسلط نہیں ہوتا۔"

عارف باللہ علامہ اقبال حضورِ حق بہ التجا فرما رہے ہیں کہ مجھے اُن اسلاف والی بصیرت اور کشفِ باطنی عطا کر جو تیرے ذکر و فکر کی مستی میں خوف و غم جیسے امراض سے ہمیشہ کوسوں دور رہتے تھے اور مجھے غلامِ خرد ہونے کی بجائے اُس عشق و جنوں سے بہرہ ور کر جو انسان

کو ایمان و یقین سے مالا مال کر دیتا ہے!

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد، تو با زمانہ ستیز ص ۲۶

مصرعِ اوّل میں اشارہ ہے شیخ سعدیؒ کے اس مشہور مصرع کی جانب:-

زمانہ با تو نہ سازد، تو با زمانہ بساز

یعنی اگر حالاتِ زمانہ تجھ سے موافقت نہیں کرتے تو زمانے کا مطیع ہو جا اور جس رخ وہ چلائے چل پڑ، اقبال کا فلسفہ حیات اس سے بالکل متضاد واقع ہوا ہے اور وہ مصرعِ دوم میں موجود ہے کہ زمانے کا مطیع و منقاد ہونے کی بجائے اُس سے جنگ آزما ہو، اپنی ہمت و شجاعت سے اُس کو شکست دے، عناصرِ شر کو مٹا، روحِ خیر کو زندہ و بیدار کر، اور اس طرح حالاتِ زمانہ کو اپنی پاکیزہ و معصوم تمناؤں کے مطابق بنا!

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی

پس اقبال کا فلسفۂ حیات "با زمانہ بساز" کا فلسفہ نہیں جو کمزوری اور پست ہمتی کا ترجمان ہو۔ وہ تو "با زمانہ ستیز" کا قائل ہے۔ سعدیؒ نے اپنی حکمت تن آسانی کا اظہار ایک اور شعر میں یوں کیا ہے:-

بدریا در منافع بے شمار است   اگر خواہی سلامت بر کنار است

چنانچہ اقبالؔ سلامتیِ کنارہ کا قائل ہی نہیں اور سراسر گردابِ موج اور ہنگامہ ہائے طوفان کی ترغیب دیتا ہے:۔

نوا

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
ہوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

(پیامِ مشرق)

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت
شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو
تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی
بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

(پیامِ مشرق)

ز تیر و صیدِ نہنگاں حکایتے آور
مگو کہ زورقِ ما آشنائے دریا نیست

(زبورِ عجم)

اس بنا پر واضح ہے کہ اقبالؔ نے انتہائی قوت سے شعرائے متقدمین کے یاس انگیز کلام کی تردید کی ہے، اور وہ اس ضمن میں سعدیؔ، حافظؔ، اور خیامؔ وغیرہ کی شخصیت سے بھی مرعوب

نہیں ہوا، کیونکہ اقبال کے نزدیک بیداری ایمان اور اصلاحِ جذبات کا ذریعہ "حسنِ زبان" نہیں بلکہ حسنِ معانی اور انقلابِ خیال ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ ظرف سے زیادہ مظروف کو اہم و مقدّم سمجھتا ہے۔ زبان کتنی ہی بامحاورہ، چُست و نوردار، رواں و دواں، فصیح اور پُر ترنّم ہو، لیکن اگر خیالات یاس انگیز اور تخریبی انداز کے ہیں، تو قوم کے روحانی، اخلاقی اور عملی ارتقا کو اس سے کیا فائدہ؟ دینی اور دنیوی مقاصد کی تسخیر سے اُس کو کیا تعلّق؟

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند ص ۳۵

آتشِ نمرود میں حضرت ابراہیمؑ کے گرنے اور صحیح سلامت نکل آنے کی طرف اس شعر میں جو اشارہ موجود ہے، اُس کی تشریح صفحہ ۱ پر ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ بندۂ مومن ہوں، لہٰذا حوادث و آفاتِ زمانہ یا ابتلائے کفر و شر میں آہ و نالہ اور حرفِ شکوہ و شکایت میرے ہونٹوں تک نہیں آسکتا۔ میں ایسا کم ظرف اور بے صبر نہیں کہ دانۂ اسپند کی مانند آگ پر گرتے ہی شور بپا کردوں گا۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکُون ص ۴۴

"کن فیکون"، ایک آیۂ قرآنی کا ٹکڑا ہے مکمل آیۂ شریفہ یوں ہے:۔

اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ ترجمہ:۔ اُس کی شان تو یہ ہے کہ جب کوئی

لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ (پ ۲۳ : ع ۳) چیز بنانا چاہتا ہے، تو اُسے حکم فرماتا ہے "ہو جا! پس وہ ہو جاتی ہے۔"

مصرع اول میں نظامِ عالم کے اصولِ ارتقاء کی جانب اشارہ کیا جا رہا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے تخلیقی عناصر ابھی نا تمام اور نامکمل ہیں، لہٰذا کسی قوتِ خلاق کی ایک مبہم صدا ہمارے گوشِ حقیقت نیوش میں چلی آ رہی ہے کہ کُن! ــــــ فیکون!! یہ گویا قانونِ ارتقاء وہ بنیادی حکم ہے جسے قدرت بطورِ وظیفہ ہمہ وقت دُہراتی رہتی ہے۔ اس قانونِ ارتقا کے تذکرہ سے اقبال کا مقصد بہرکیف یہ ہے کہ کائنات کے دیگر عناصر کو ترقی کے ساتھ ہی ساتھ اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الٰہی (انسان) کو بھی اپنی روحانی اور اخلاقی ترقی کے مدارج تیزی سے طے کرنا چاہئیں اور وہ مقام حاصل کرنا چاہیئے جو خلافتِ ارضی کے شایانِ شان ہے۔ انسان کی اسی ارتقائی قوت کی جانب ایک قطعہ میں بھی اشارہ کیا ہے:۔

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد\
بیک صورت قرار زندگی نیست\
اگر امروز تو تصویرِ دوش است\
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

یعنی "زندگی ہر لمحہ کوئی نہ کوئی تازہ نقشِ حیات پیدا کرتی رہتی ہے، اور وہ صرف ایک حالت پر قرار نہیں پکڑتی۔ بنا برایں اگر تیرا آج (حال) تیرے کل (ماضی) ہی کی تصویر ہے،

اور اُس میں زرقی کا کوئی عنصر دکھائی نہیں دیتا، تو سمجھ لے کہ تیری خاک میں زندگی کا کوئی سوز ہی نہیں ہے"۔

جس کا عمل ہے بے غرض اُس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر ۴۶

اس شعر میں اہلِ تصوّف کے مسئلہ اخلاص و توحید کی جانب اشارہ کیا جارہا ہے۔ اس مضمون پر مفصل بحث کے لئے صفحہ ملاحظہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ جو لوگ محض رضائے الٰہی کے لئے عبادت کرتے ہیں، وہ بہشت اور اُس کی گوناگوں نعمتوں کو تصور میں بھی نہیں لاتے، کیونکہ ان کی تمنا میں شرک و نفس پرستی کی آلائش پائی جاتی ہے۔ مومن کا قبلہ مقصود ہر حالت میں اللہ اور صرف اللہ ہے، اور اللہ کے سوا ہر دوسری چیز کی محبت و خواہش کو وہ بت پرستی سمجھتا ہے:۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

اِس شعر میں اشارہ ہے اُس گفتگو کی جانب جو اللہ تعالیٰ اور حضرت موسےٰؑ کے مابین وادیٔ طویٰ

میں ہوئی۔ جب حضرت موسیٰؑ سفر کرتے کرتے تھک گئے اور اپنی زوجہ کے ساتھ دامن طور میں سستانے کو ٹھہرے، تو دُور سے آگ دکھائی دی۔ جب قریب پہنچے تو ایک درخت تجلیات سے معمور تھا۔ یکایک آواز آئی، "میں خدا ہوں! اے موسیٰؑ! تو اس وقت وادی مقدس طویٰ میں ہے، لہٰذا جوتا اتار دے۔" پھر حکم ہوا کہ اپنا عصا زمین پر پھینک دے، یہ اژدہا کی صورت اختیار کرلے گا۔ عصا پھینکا گیا، اور جونہی وہ ہیبت ناک اژدہا بنا، حضرت موسےٰؑ خائف ہوکر بھاگے۔ آواز آئی۔

خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ (پ ۱۶: ع ۹)

یعنی "اے موسیٰ! اسے پکڑ لے اور خائف مت ہو۔ یہ بہت جلد اپنی پہلی شکل و صورت اختیار کرلے گا۔"

چنانچہ حضرت موسےٰؑ نے اسے پکڑ لیا، اور وہ حسبِ سابق عصا بن گیا۔ اس بنا پر شعر کا مفہوم مقصد یہ ہے کہ اگر آج بھی کوئی شخص ایمان کامل کے ساتھ مثلِ کلیمؑ باطل کے خلاف جنگ آزما ہو اور پوری جرأت و ہمت اور اعتماد علی اللہ سے حق کی حمایت میں جہاد کرے، تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے خوف و ہراس کے تمام اسباب فنا کر دیئے جائیں گے، اور فتح بہرکیف مومنین کی ہوگی!

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

"سحرِ قدیم" سے اشارہ کیا جا رہا ہے جادوگروں کے اُس سحر کی جانب جو اُنہوں نے بحکم فرعون شکستِ موسےٰؑ کے لئے استعمال کیا، یومِ زینت کو (جو فرعون کا جشن دن تھا) ساحلِ نیل پر وقت کے ماہر ترین جادوگر جمع کئے گئے، اور تمام اہلِ مصر کو دعوت دی گئی کہ وہ آکر موسےٰؑ کی شکست و ذلت کا منظر دیکھیں اور عبرت پکڑیں۔ چنانچہ جادوگروں نے (جو حسبِ روایت ۳۶۰ تھے) بڑے سے بڑا کرشمہ یہ دکھایا کہ رسیاں زمین پر پھینکیں اور وہ فوراً سانپ بن گئیں۔ سحر کا یہ نیا عمل دیکھ کر حضرت موسےٰؑ کسی قدر خائف ہوئے، یکایک غیب سے آواز آئی کہ لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (پ۱۶: ۱۱ع) "اے موسیٰؑ! خائف مت ہو، کیونکہ فتح یقیناً تیری ہی ہو گی۔" یہ سُنتے ہی حضرت موسےٰؑ کی ہمّت و شجاعت بڑھی، اور اُنہوں نے عصا زمین پر مارا جو اژدہا بن گیا اور تمام سانپوں کو دیکھتے دیکھتے ہڑپ کر گیا۔ جادوگروں نے جب یہ معجزہ دیکھا تو حضرتِ موسےٰؑ کو ایک سچّا پیغمبر تسلیم کیا، ایمان لائے، اور خدائے واحد کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ اس بنا پر شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عہدِ حاضر کی دانش (یعنی سیاسی چالبازیاں جو تہذیبِ مغرب کی پیدا کردہ ہیں) عہدِ فرعونی کے سحرِ قدیم سے کسی طرح کم نہیں، پس ان سیاسی اور سماجی فریب کاریوں اور منطقی دھوکوں کو توڑنے کے لئے عصائے موسوی کی ضرورت ہے، اور مردِ مومن چاہے تو آج بھی اپنی قوتِ ایمانی سے "یدِ بیضا" جیسی فاتح اور کامیاب شئے پیدا کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر عہد میں مومن سے مطالبہ فرماتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ "اے ایمان والو! اللہ کے سچے مددگار ہو جاؤ" پس سب مومن کا جواب یہ ہو کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ

"ہم اللہ تعالےٰ کی مدد کے لئے ہمہ تن آمادہ ہیں" تو پھر اہلِ حق کی فتح یقینی ہے !

تھا اَرِنی گو کلیمؑ ، میں اَرِنی گو نہیں
اُس کو تقاضا روا ، مجھ پہ تقاضا حرام ص ۹۱

"اَرِنِی" (الٰہی مجھے اپنا جلوہ دکھا) اور لَنْ تَرَانِیْ (تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا) کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ اور حضرتِ موسےٰؑ کی گفتگو کی جانب اشارات ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ عشق کا کمال تو یہ ہے کہ حبیبِ حُسن، دیدار و جلوہ ریزی سے انکار کر دے، تو فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا جائے اور طالبِ دیدار کی جانب سے کسی قسم کا تقاضا نہ ہو۔ عاشقِ صادق وہ ہے جو رضائے محبوب میں فنا ہو جاتے اور ذاتی خواہشات کو اُس کی خوشنودی پر نثار کر دے، بنابریں کلیمؑ نے تو "اَرِنِی" کا پیہم تقاضا کیا۔ لیکن میں اس سوال کو نہیں دُھراتا۔ وہی مضمون ہے کہ :-

شوخی سی ہے سوالِ مکرّر میں اے کلیمؑ
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ ص ۹۳

داستانِ حرم کی ابتدا یہ ہے کہ نافِ زمین میں اس خانۂ خدا کو حضرتِ ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ دونوں باپ بیٹے نے مل کر تعمیر کیا۔ اور تمام مسلمانانِ عالم کے لئے توحید اور ذکر و عبادت

کا عظیم ترین مرکز بنایا۔ اس مقدس عمارت کے در و دیوار کو اسمٰعیل جیسے مقدس فرزند نے استوار کیا، وہ فرزند جس نے رضائے الٰہی کے لئے اپنے سر کی قربانی کو بھی بازیِ طفلانہ سمجھا۔ داستان کی ابتدا چونکہ ایسے ہی جری، جانباز اور حق پرست انسان سے ہوتی تھی، اور اُس کی انتہا بھی یہ شان رکھتی ہے کہ لوحِ کعبہ کی رنگ کو حسینؓ نے اپنے خون سے سینچا۔ آلِ رسول ﷺ کے برگزیدہ اور فخرِ روزگار افراد کی پے در پے قربانیاں اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اُف تک نہ کی، حد یہ ہے کہ معصوم بچوں کو بھی پیاس سے جان توڑتے دیکھ کر اُس کے عزم و استقلال اور جذبۂ حق پرستی میں ذرہ برابر ضعف نہ آیا۔ اُس نے یزید جیسے فاسق و فاجر شخص کی اطاعت پر جابرانہ موت کو ترجیح دی، اور خوف و شکست جیسے الفاظ کو قیامت تک کے لئے بے معنی قرار دیا، لہٰذا ایمان و عقیدت کے اوج سے انتہائی فخر و احترام کے ساتھ اعلان کیا جا سکتا ہے کہ حسین غریب (نادرہ عجیب) سادہ (معصوم) اور رنگین (رنگین از خونِ شہیدوں) داستان کی ابتدا اسمٰعیل تھا اُس کی انتہا (معراجِ عمل) حسین علیہ السلام جیسے پاک ضمیر اسلام اور فنا فی التوحید غازی کی شہادت پر ہوئی۔

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

ایک حدیثِ قدسی کے الفاظ یہ ہیں۔ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ۔ یعنی "اے نبیؐ! اگر میں آپ کو پیدا نہ کرتا، تو تمام کائنات کو پیدا نہ کرتا۔ بالفاظِ دیگر اس کا مفہوم یہ ہوا

کہ اللہ تعالیٰ نے ارض و سما اور ما فیہا کو فقط رحمۃ اللعالمین ہی کے لئے پیدا کیا۔ چنانچہ اس مضمون کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ جب تمام کائنات کی تخلیق سراسر آنحضرتؐ کے لئے عمل میں آئی تو جو قوم ایسے برگزیدہ نبیؐ کی اُمت ہوگی، وہی قوم صحیح معنوں میں تمام دُنیا کی وارث اور حاکم و مختار سمجھی جائے گی۔ ہاں، اس وراثت اور حکومتِ عالم کے لئے قرآن حکیم نے ایک شرط ضرور لگائی ہے۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ عالم لوگ صاحبِ ایمان و یقین، متقی اور صالح ہوں، ملاحظہ ہو ذیل کی آیہ شریفہ:-

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۔ (پ ۱۷ ع ۷)	ترجمہ: اور ہم تو زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ ہم اپنی زمین کا وارث اپنے نیک بندوں کو کریں گے۔

پس یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے بھی وراثتِ ارضی اور حکومتِ عالم کے لئے فقط مردِ مومن ہی کو مخصوص کر دیا ہے کہ یہ وراثت کافر و فاسق کا حق ہی نہیں۔ خدا کی زمین کے وارث خدا کے وفادار بندے ہی ہو سکتے ہیں:-

یہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی ۔۔۔ مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

آذر کا پیشہ خارا تراشی
کارِ خلیلاں خارا گدازی

ص ۱۰۳

آذر کا صنم خانہ باطل پرست قوم کے دیوتاؤں اور مصنوعی خداوندوں سے معمور رہتا تھا، اور اس بنا پر خارا تراشی کا فن خوب ترقی پر تھا، پس کفر و شرک کے اس فن کو تنزل کا راستہ دکھایا تو فقط دستِ خلیل اللہ نے، جب کہ کفّار کی عدم موجودگی میں اُنھوں نے تمام بُت توڑ کر کلہاڑا سب سے بڑے بُت کے کاندھے پر رکھ دیا تھا۔ جب مشرکین نے واپس آکر بےادب حملہ آور کا نام پوچھا، تو فرمایا: "اپنے بڑے معبود سے پوچھو جو کلہاڑا لئے کھڑا ہے۔"

پس بقولِ اقبال بُت شکنی اور خارا گدازی کا یہ مبارک فعل فقط ابراہیمؑ ہی پر ختم نہیں ہو گیا، بلکہ ہر دور میں ہر مومن اور موحّدِ صادق کا یہ فرض ہے کہ کفر و شرک کے آثار کو روئے زمین سے فنا کر کے توحید کا علم بلند کرتا رہے!

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیّری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی ص۱۰۵

اہلِ کوفہ نے حسین علیہ السلام کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ آپ اگر یہاں تشریف لائیں تو ہم فوراً آپ کی بیعت کرلیں، کیونکہ آپ ہی کی بیعت، بیعتِ حق ہے، اور ہم یزید کی اطاعت کو سراسر پیروئ باطل سمجھتے ہیں، اور اُس سے متنفر ہیں۔ چنانچہ ایک دنیا جانتی ہے کہ یہ اہلِ کوفہ کا ایک خطرناک فریب تھا، جسے یزید ہی کے عملے نے وضع کیا تھا۔ اس فریب کا نتیجہ میدانِ کربلا کے خونچکاں اور رقت انگیز واقعات کی صورت میں رونما ہوا۔ بایں ہمہ حق و صداقت کی راہ پر ثابت قدم رہ کر شبیرؑ نے اپنی شہادت سے جو حقیقتِ ابدی لوحِ عالم

پر منقوش کی، اُسے قیامت کے زلزلے بھی محو نہیں کر سکتے۔ بخلاف اس کے کوئی یا اُن کی فریب کار اور کفر نواز نسل کے انداز ہر زمانے میں روئے زمین کے ہر خطے پر بدلتے رہتے ہیں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ باطل اور اہلِ باطل کا کوئی ایمان نہیں، کوئی مرکزِ فکر و عمل نہیں، کوئی اخلاقی اصول نہیں، اور انسانیت کے ساتھ کوئی جذبۂ دیانت و ہمدردی نہیں:

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسروؔ صـ۱۰۷

اس شعر میں جنگ و جدل اور ظلم و استبداد کی مذمت کرتے ہوئے اقبالؒ روحِ شاعری کی تعمیری و اصلاحی قوتوں کو اس پر ترجیح دے رہا ہے مفہوم یہ ہے کہ سلطان قطب الدین ایبک اور شہاب الدین غوری (مراد ہر وہ شہنشاہ جو فتح و تسخیر اور ملک گیری کا حریص ہو) کے معرکے تو بڑی مدت سے محو و فنا ہو چکے ہیں اور آج انہیں کوئی جانتا تک نہیں لیکن نغمۂ خسروؔ یعنی امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین ولی اللہ کے شیریں اور روح پرور اشعار اب بھی زندہ و پائندہ اور مقبول خاص و عام ہیں:

حاصل کلام یہ ہے کہ انسانیت کے لئے تخریبی کارنامے، خواہ وہ وقتی طور پہ کتنے ہی مہیب و عظیم کیوں نہ ہوں، صفحۂ روزگار سے فوراً محو ہو جاتے ہیں، لیکن اصلاحی و تعمیری کلام بہر حال زندۂ جاوید ہے، اور قوم کے روحانی و اخلاقی عناصر کو ہر وقت فروغ دیتا رہتا ہے۔ شعر کی شان میں اقبالؒ کے ان ہر دو اشعار پہ غور فرمائیے۔

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

صد نالۂ شبگیرے، صد صبحِ بلاخیزے
صد آہ شرر ریزے، یک شعرِ دلآویزے

تکرار تھی مزارعِ مرا کی حقیقت کے اندر تو نہیں
وہ سلسلۂ قافلہ سالاروں میں

تکرار تھی تو بھیجے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیمُ اللّٰہی! (ص ۱۳۸)

جب حضرت موسیٰ مصر سے ہجرت کر کے مدین تشریف لے گئے تو وہاں شعیب علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ وہ خود بہت ضعیف تھے اور بجز دو لڑکیوں کے کوئی نرینہ اولاد نہیں رکھتے تھے جو عالمِ پیری میں ان کا سہارا ہو، اور روزانہ کا کام یعنی بکریاں چرانے کی خدمت سرانجام دے۔ حضرت شعیب نے دورانِ گفتگو میں فرمایا کہ آپ دس برس میرے یہاں قیام فرمائیں اور یہاں تک بن پڑے میری خدمت کریں۔ اس دوران میں فرعون کی آتشِ غضب بھی سرد ہو جائے گی، اور پھر آپ میری لختِ جگر سے نکاح کر کے وطن کو واپس جا سکتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک عارف باللہ بزرگ کا یہ مطالبہ منظور کر لیا۔ اور مسلسل دس برس نہ صرف بکریاں چرائیں، بلکہ حضرت شعیب سے غیر متناہی روحانی فیض بھی حاصل کیا۔ چنانچہ جب آپ مصر کو واپس ہوئے

تو داستے ہیں وادیٔ طویٰ سے گذر ہوا، جہاں پیغمبری کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔ اِس طرح گویا "شبانی" کی تمہید سے یکایک کلیم اللٰہی کا مقام حاصل کیا۔ حکمت اس میں یہ ہے کہ انسانوں کی قیادت و رہنمائی سے پہلے قدرت نے انہیں بھیڑ بکریوں کے گلے میں رہنمائی اور تنظیم ملت کی "ٹریننگ" دی اور یہی ٹریننگ نتیجہ کار تمہید بنی پیغمبری کی۔

اس بنا پر علامہ اقبال کو شکایت ہے کہ آج کے قافلہ سالاروں (یعنی لیڈروں اور رہنماؤں) میں نہ وہ سلیقہ، وہ آداب و شرائط، اور تنظیم قوم و ملت کی وہ صفات دکھائی نہیں دیتیں، جو ایک صحیح اور کامیاب رہنما کے لئے نہایت ضروری ہیں، اور جن کے ہوتے ہوئے وہ قوم کے لئے ایک اچھا عملی و اخلاقی "نمونہ" بن سکتے ہیں۔ اسی رنج میں ایک جگہ فرمایا ہے:۔

زُرخ سوئے میخانہ دارد پیر ما
چیست یاراں بعد ازیں تدبیرِ ما

اور اسی رنج و شکایت کے ترجمان ہیں مندرجہ ذیل اشعار بھی:۔

منزلِ راہرواں دُور بھی ہے دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اِس دَور کے ملّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟

مریدِ سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق

علم کا موجود اور فقر کا "موجود" اور
اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰه

علم کا "موجود" تو وہ تمام مادی اشیا ہیں جو کائناتِ عالم میں بیّن طور پر دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہیں، لیکن فقر کا "موجود" وہ غائب ہستی ہے جو غائب رہ کر بھی معنوی حیثیت سے ارض و سما کی ہر چیز میں عیاں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:- "اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" "جس طرف بھی منہ پھیرو اللہ کے چہرۂ جمیل کو موجود پاؤ گے" پس کائنات کے ذرّے ذرّے میں چونکہ خالق کی صنعت اور اُس کا نور جاری و ساری ہے۔ لہٰذا موجودِ حقیقی مخلوق نہیں بلکہ خالق ہے۔ علاوہ ازیں مخلوقات میں سے چونکہ ہر جاندار یا غیر جاندار چیز فانی ہے، اور فقط خالق ہی حیُّ القیّوم اور دوام و ابد ہے، لہٰذا اس جہت سے بھی موجودِ حقیقی اُس کی ذات بے ہمتا قرار پائی۔ ایک اور آیۂ شریفہ میں فرمایا:-

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (پ ۲۷، الحدید)

ترجمہ:- "خدائے تعالیٰ ہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ اور وہ ہر چیز کو اچھی طرح جانتا ہے۔"

پس انہیں شواہد کی بنا پر صوفیاء نے یہ اصول قائم کیا کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ۔ یعنی "کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی شے موجود نہیں"۔ بالفاظِ دیگر اگر کچھ موجود ہے، تو فقط اللہ ہے، اور اللہ ہی اقبال کے نزدیک فقر کا موجود مقصود ہے، باقی سب دھوکا ہے!

دمِ عارف نسیمِ صبح دم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسّر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے
صـ ۱۲۵

حضرت موسیٰؑ اور حضرت شعیبؑ کی ملاقات اور روحانی تعلّقات کا مفصّل تذکرہ صفحہ ۱۶۴ پر کیا جا چکا ہے۔ "دو قدم" سے اشارہ مقصود ہے اُس قلیل وقت کی جانب جو "شبانی" اور "کلیمی" کے درمیان گزرا۔ بکریاں چرانے سے فارغ ہوتے ہی حضرت موسیٰ مدین سے رخصت ہوئے اور وادیٔ طوریٰ میں "کلیم اللہ" ہونے کا شرف حاصل کیا۔ پس مقصدِ اقبال یہ ہوا کہ "دمِ عارف" خاک کو بھی اکسیر بنا سکتا ہے، اور اس کے اثر سے انسان برق رفتاری کے ساتھ معراجِ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کُشا کارساز
صـ ۱۳۲

یہ شعر نظم "مسجدِ قرطبہ" میں سے ہے۔ قرآنِ حکیم کی بعض آیات اس حقیقتِ صادقہ پر شاہد

ہیں کہ جب انسان صحیح معنوں میں مومن ہو، اور اللہ تعالیٰ ہی کو ہر لحاظ سے کافی و شافی اور مختار نفع و ضرر سمجھے تو مومن کا ہاتھ فی الواقعہ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ جو کفر و شر پر "غالب" بھی ہے مشکلات اور موانع کے باوجود "کارکشا" بھی ہے، اور درماندہ و بےکس خلقِ خدا کے لئے "کارساز" بھی ہے۔ الغرض دستِ مومن سے اہلِ عالم کو تمام قسم کی تعمیری و اصلاحی برکات حاصل ہوتی ہیں، اور یہ اس لئے کہ وہ روئے زمین پر خدائے رزاق و رحیم کا علیہ الرحمت و ظلِ رحمت ہے۔ ایک مرتبہ مقام حدیبیہ میں آنحضرت ﷺ نے اصحاب کرام سے کفار کے خلاف جہاد میں جاں نثاری کا عہد لیا تھا، اور یہ عہد بیعت کی صورت میں محکم کیا گیا تھا۔ یہ بیعت تاریخ میں "بیعتِ رضوان" کے نام سے مشہور ہے اس موقع پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے جذبۂ حق پرستی اور عہد و وفاداری سے اس قدر خوش ہوا کہ ان کی عزت افزائی فرماتے ہوئے یہ آیہ شریفہ نازل فرمائی:-

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (پ ۲۶ ع ۹)	ترجمہ: بے شک جو لوگ تجھ سے (اے پیغمبر! حدیبیہ میں) بیعت کر رہے ہیں، وہ گویا خدا سے بیعت کر رہے ہیں، اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے پھر جو کوئی (اپنا اقرار) توڑے وہ اقرار توڑ کر اپنا آپ نقصان کرے گا، اور جو کوئی اس اقرار کو پورا کرے جو اُس نے اللہ کے ساتھ باندھا، اُسکو اللہ تعالیٰ بہت بڑا بدلہ دیگا۔

پس اس بنا پر معلوم ہُوا کہ جب مومن حق و صداقت کی حمایت میں تن من دھن سے آمادہ و کمر بستہ ہو جائے تو اُس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے، جس کی قوتِ تسخیر کے سامنے باطل کا ہر نظام اور ہر لشکر شکستِ فاش اُٹھاتا ہے!

اس ضمن میں عرض ہے کہ کیا ایک مٹھی بھر کنکروں نے کفار کے پورے لشکر کو اندھا نہیں کر دیا تھا؟ اس کی وجہ خدائے قادر و قیوم نے یہ بیان فرمائی کہ :۔ وَمَا رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ یعنی " اے نبی! وہ کنکر تو نے نہیں، بلکہ اللہ کے ہاتھ نے کفار پہ پھینکے تھے": پس ثابت ہے کہ :۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

آہ وہ مردانِ حق وہ عربی شہسوار
حاملِ خلقِ عظیم، صاحبِ صدق و یقیں ۔ ص ۱۳۳

یہ شعر بھی نظم "مسجدِ قرطبہ" میں ہے ۔ مصرع دوم میں اشارہ ہے اس آیۂ قرآنی کی جانب :۔ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (پ ۲۹ : ع ۲) یعنی " اے نبی! میں نے تجھے خلقِ عظیم عطا فرما کر دنیا میں بھیجا ہے" ۔ پس حسبِ آیۂ قرآنی :۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ ۔ " ترجمہ:" اور جو کوئی اللہ کی رضا اور روزِ قیامت (نجات) کا آرزو مند ہو، اُس کے لئے رسولِ کریم

اَلْیَوْمَ الْاٰخِرَ (پ ۲۱ : ۱۹ع) کی زندگی نہایت اچھا نمونہ ہے (عملی طور پر پیروی کرنے کے لئے)"

آنحضرتؐ کے اخلاق و اعمال چونکہ ہر فردِ امّت کے لئے اسوۂ حسنہ (ایک خوبصورت نمونہ) ہیں۔ لہٰذا تمام مردانِ حق اور پیروانِ نبیؐ، حاملِ خُلقِ عظیم اور صاحبِ صدق و یقین قرار پاتے!

جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں ۱۳۳

یہ شعر بھی "مسجدِ قرطبہ" میں سے ہے۔ "تربیتِ شرق و غرب" سے مراد ہیں وہ تمام روحانی اخلاقی اور عملی فیوض جو مسلمانوں نے نزولِ قرآن اور ظہورِ اسلام کے بعد مصر، شام، ایران، اندلس، قرطبہ، غرناطہ، قسطنطنیہ، بغداد اور ہندوستان وغیرہ میں پھیلائے، وہ جہاں بھی گئے نورِ آفتاب اور آبِ چشمۂ شیریں کی مانند روئے زمین کے ہر خطّے کو سیراب کرتے چلے گئے اور اپنی قلبی اور روحانی صلاحیتوں کی تقسیم میں بخل کو مطلق دخل نہیں دیا۔ اُن کے اِس جذبۂ فیض رسانی، تبلیغِ حق اور خدمتِ خلق کی ایک مؤثر تصویر مولانا حالیؔ کے الفاظ میں بے نظیر انداز میں پیش کی گئی ہے۔

"عربی شہسواروں" کی تربیت شرق و غرب کا دلپسند پُر مرقّع ملاحظہ ہو:۔

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی — پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اس کی پہنچی — جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

کیا امیوں نے جہاں میں اجالا — ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
بتوں کو عرب اور عجم سے نکالا — ہر اک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا
زمانہ میں پھیلائی توحیدِ مطلق
لگی آنے گھر گھر سے آوازِ حق حق

ہوا غلغلہ نیکیوں کا بدوں میں — پڑی کھلبلی کفر کی سرحدوں میں
ہوئی آتش افسردہ آتش کدوں میں — لگی خاک سی اڑنے سب معبدوں میں
ہوا کعبہ آباد سب گھر اجڑ کر
جمے ایک جا سارے دنگل بچھڑ کر

لئے علم و فن ان سے نصرانیوں نے — کیا کسبِ اخلاق روحانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں نے — کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے
ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ہر اک میکدہ سے بھرا جا کے ساغر ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثلِ پروانہ ہر روشنی پر گرہ میں لیا باندھ حکمِ پیمبرؐ
کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو

ہر اک علم کے فن کے جویا ہوئے وہ ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل دیکتا ہوئے وہ سیاحت میں مشہورِ دُنیا ہوئے وہ
ہر اک ملک میں اُن کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے اُن سے سیکھی تجارت

کیا جا کے آباد ہر ملکِ ویراں مہیا کیے سب کی راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں اُنہیں کر دیا رشکِ صحنِ گلستاں
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود اُن کی لگائی ہوئی ہے

یہ ہموار سڑکیں یہ راہِ مصفّا دو طرفہ برابر درختوں کا سایا
نشاں جا بجا میل و فرسنگ کے برپا سر رہ کنوئیں اور سرائیں مہیا
اُنہیں کے ہیں سب نے یہ چربے اُتارے
اُسی قافلہ کے نشاں ہیں یہ سارے

سدا اُن کو مرغوب سیر و سفر تھا ہر اک برِّ اعظم میں اُن کا گزر تھا
کھنگالا ہوا اُن کا سب بحر و بر تھا جو لنکا میں ڈیرا تو بربر میں گھر تھا
وہ گنتے تھے یکساں وطن اور سفر کو
گھر اپنا سمجھتے تھے ہر دشت و در کو

جہاں کو ہے یاد اُن کی رفتار اب تک کہ نقشِ قدم ہیں نمودار اب تک
کلابا میں ہیں اُن کے آثار اب تک اُنہیں رو رہا ہے ملیبار اب تک
ہمالہ کو ہیں واقعات اُن کے ازبر
نشاں اُن کے باقی ہیں جبرالٹر پر

نہیں اس طبق پر کوئی برِّ اعظم نہ ہوں جن میں اُن کی عمارات محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، دیلم بناؤں سے ہے اُن کی معمور عالم
سرِ کوہِ آدم سے تا کوہِ بیضا
جہاں جاؤ گے پاؤ گے کھوج اُن کا

وہ سنگیں محل اور وہ اُن کی صفائی جمی جن کے کھنڈروں پہ ہے آج کائی
وہ مرقد کہ گنبد تھے جن کے طلائی وہ مسجد جہاں جلوہ گر تھی خدائی
زمانہ نے گو اُن کی برکت اُٹھا لی
نہیں کوئی ویرانہ پر اُن سے خالی

ہوا اندلس اُن سے گلزار یکسر — جہاں اُن کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر — یہ ہے بیتِ حمرا کی گویا زباں پر

کہ تھے آلِ عدنان سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی

ہویدا ہے غرناطہ سے شوکت ان کی — عیاں ہے بلنسیہ سے قدرت ان کی
بطلیموس کو یاد ہے عظمت اُن کی — ٹپکتی ہے قادس پہ حسرت اُن کی

نصیبا اُن کا اشبیلیہ میں ہے سوتا
شب و روز ہے قرطبہ اُن کو روتا

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے — مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے — خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

جلال اُن کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

وہ بلدہ کہ فخرِ بلادِ جہاں تھا — ترو خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گرا جس پہ عباسیوں کا نشاں تھا — عراقِ عرب جس سے رشکِ جناں تھا

اُڑا لے گئی بادِ پندار جس کو
بہا لے گئی سیلِ تاتار جس کو

سُنے گوشِ عبرت سے گر جا کے انساں　　　تو واں ذرّہ ذرّہ یہ کرتا ہے اعلاں
کہ تھا جن دنوں مہرِ اسلام تاباں　　　ہُوا یاں کی تھی زندگی بخشِ دوراں
پڑی خاکِ اتھینز میں جاں یہیں سے
ہُوا زندہ پھر نامِ یوناں یہیں سے

وہ لقمان و سقراط کے دُرِّ مکنوں　　　وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطوں
ارسطو کی تعلیم سولن کے قانوں　　　پڑے تھے کسی قبرِ کہنہ میں مدفوں
یہیں آ کے مُہرِ سکوت اُن کی ٹوٹی
اسی باغِ رعنا سے بُو اُن کی پھوٹی

یہ تھا علم پر واں توجہ کا عالم　　　کہ ہو جیسے مجروح جویائے مرہم
کسی طرح پیاس اُن کی ہوتی نہ تھی کم　　　بجھاتا تھا آگ اُن کی باراں نہ شبنم
حریمِ خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن　　　یہ تھا اُن کی کرنوں سے تا غرب روشن
نوشتوں سے ہیں جن کے اب تک مزیّن　　　کتب خانۂ پیرس و روم و لندن!
پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے کھنڈروں میں

وہ سنجار کا اور کوفہ کا میداں — فراہم ہوئے جس میں مسّاح دوراں
کرہ کی مساحت کے پھیلائے ساماں — ہوئی جزو سے قدر کُل کی نمایاں

زمانہ وہاں آج تک نوحہ گر ہے
کہ عباسیوں کی سبھا وہ کدھر ہے

سمرقند سے اندلس تک سراسر — انہیں کی رصدگاہیں تھیں جلوہ گستر
سوادِ مراغہ میں اور قاسیوں پہ — زمیں سے صدا آرہی ہے برابر

کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجّم کہاں ہیں

مؤرّخ جو ہیں آج تحقیق والے — تفحّص کے ہیں جن کے آئیں نرالے
جنہوں نے ہیں عالم کے دفتر کھنگالے — زمیں کے طبق سر بسر چھان ڈالے

عرب ہی نے دل اُن کے جاکر اُبھارے
عرب ہی سے وہ پھرنے سیکھے ترارے

اندھیرا تواریخ پر چھا رہا تھا — ستارہ روایت کا گہنا رہا تھا
درایت کے سورج پہ ابر آرہا تھا — شہادت کا میدان دھندلا رہا تھا

سرِ رہ چراغ اک عرب نے جلایا
ہر اک قافلہ کا نشاں جس سے پایا

گروہ ایک جویا تھا علمِ نبیؐ کا　　لگایا پتا جس سے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذبِ خفی کا　　کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کئے جرح و تعدیل کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو　　اِسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سُنا خازنِ علمِ دیں جس بشر کو　　لیا اُس سے جاکر خبر اور اثر کو
پھر آپ اُس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزا اُس کا چکھ کر

کیا فاش راوی میں جو عیب پایا　　مناقب کو چھانا مثالب کو تانا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا　　ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ ملّا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

رجال اور اسانید کے جو ہیں دفتر　　گواہ اُن کی آزادی کے ہیں وہ یکسر
نہ تھا اُن کا احساں یہ اک اہلِ دیں پر　　وہ تھے اس میں ہر قوم و ملّت کے رہبر
لبرٹی میں جو آج فائق ہیں سب سے
نباہیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے

فصاحت کے دفتر تھے سب گاؤ خوردہ — بلاغت کے رشتے تھے سب ناسپردہ
ادھر روم کی شمع انشاء تھی مردہ — اُدھر آتشِ پارسی تھی فسردہ
یکایک جو برق آ کے چمکی عرب کی
کھلی کی کھلی رہ گئی آنکھ سب کی

عرب کی جو دیکھی وہ آتش بیانی — سنی برمحل اُن کی شستہ بیانی
وہ اشعار کی دل میں ریشہ دوانی — وہ خطبوں کی مانند دریا روانی
وہ جادو کے جملے وہ فقرے فسوں کے
تو سمجھے کہ گویا ہم اب تک تھے گونگے

سلیقہ کسی کو نہ تھا مدح و ذم کا — نہ ڈھب یاد تھا شرح شادی و غم کا
نہ اندازِ تلقین و عظ و حکم کا — خزانہ تھا مدفون زبان اور قلم کا
نواسنجیاں اُن سے سیکھیں یہ سب نے
زباں کھول دی سب کی اُمی عرب نے

زمانہ میں پھیلی طب اُن کی بدولت — ہوئی بہرہ ور جس سے ہر قوم و ملت
نہ صرف ایک مشرق میں تھی اُن کی شہرت — مسلّم تھی مغرب تک اُن کی حذاقت
بسلرنو میں جو ایک نامی مطب تھا
وہ مغرب میں عطارِ مشکِ عرب تھا

ابوبکر راضی، علی ابنِ عیسٰے — حکیم گرامی حسین ابنِ سینا
حسین ابنِ اسحاق و قسطیں دانا — ضیاء ابن بیطار راس الاطبّا

انہیں کے ہیں مشرق میں سب نام لیوا
انہیں سے ہوا پار مغرب کا بیڑا

غرض فن ہیں جو مایۂ دین و دولت — طبیعی، الٰہی، ریاضی و حکمت
طب اور کیمیا ہندسہ اور ہیئت — سیاحت، تجارت، عمارت، زراعت

لگاؤ گے کھوج ان کا جاکر جہاں تم
نشاں ان کے قدموں کے پاؤ گے واں تم

ہوا گو کہ پامال بستاں عرب کا — مگر اک جہاں ہے غزل خواں عرب کا
ہرا کر گیا سب کو باراں عرب کا — سپیدہ سیہ پر ہے احساں عرب کا

وہ قومیں جو ہیں آج سرتاج سب کی
کنوڑی رہیں گی ہمیشہ عرب کی

مسدّسِ حالی کے مندرجہ بالا انتخاب سے بہ حقیقت نہایت تسلی بخش طور پر واضح ہے کہ عربوں نے تمام دنیا میں اپنے فیوض و برکات کس شان سے تقسیم کئے اور عربی شہسواروں نے مشرق اور مغرب کی روحانی، جسمانی، علمی، صنعتی اور اقتصادی "تربیت" کس جرأت و ہمت سے کی!

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ "لاتذر" میں ص ۱۴۳

یہ شعر "طارق کی دعا" میں سے ہے۔ لاتذر ٹکڑا ہے اس آیہ شریفہ کا:۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (پ ۲۹ ع ۹) ترجمہ: "پروردگار! رُوئے زمین پر ایک کافر بھی زندہ و سلامت نہ رہنے دے"۔

یہ بددعا حضرت نوحؑ نے اُس وقت کی جبکہ تمام عمر تبلیغِ حق کرنے کے بعد بھی قوم میں سے کسی شخص نے اُن کی اطاعت نہ کی، بلکہ ہر ممکن طریقے سے تعلیماتِ مذہب کی تذلیل و تضحیک کی۔ چنانچہ یہ دُعا خدائے غیور نے فوراً قبول کی اور پانی کا وہ طوفان بھیجا جسے دُنیا "طوفانِ عظیم" کے نام سے یاد کرتی ہے؛ اور حسبِ منشا خدا کے دُعا اُس طوفان کی زد سے رُوئے زمین کا ایک کافر بھی زندہ و سلامت نہ رہ سکا۔ چنانچہ طارق بھی درگاہِ خداوندی میں دستِ بدعا ہے کہ الہٰی! قلبِ مومن میں نعرۂ "لاتذر" کی وہ بجلی دوبارہ زندہ کر جس نے چشم زدن میں کفّار کی تمام آبادیوں کو فنا کر دیا تھا!

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات ص ۱۵۲

یہ شعر نظم "ذوق و شوق" میں سے ہے۔ حسین علیہ السلام چونکہ دریائے فرات کے کنارے میدانِ کربلا میں شہید ہوئے تھے، لہٰذا فرماتے ہیں کہ وہ منتظر دیکھنے والے دریا تو

اُسی سج دھج اور پیچ و تاب سے بہہ رہے ہیں، لیکن افسوس کہ حسینؓ کے جذبۂ سرفروشی اور شوقِ شہادت کی مثال پیش کرنے والا ایک انسان بھی موجودہ قافلۂ حجاز میں دکھائی نہیں دیتا۔ وہی مضمون ہے کہ :-

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسداللٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری

جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات !
اُس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا ؟

یہ شعر نظم "جبریل و ابلیس" میں سے ہے۔ "تَقْنَطُوْا" یعنی مایوس و ناامید ہو"۔ لَاتَقْنَطُوْا یعنی "مایوس ہرگز مت ہو"۔ یہ ٹکڑا ہے اس آیۂ شریفہ کا :-

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝

(پ۲۴ : ع۲)

ترجمہ: "اے پیغمبرؐ! (میری جانب سے) اعلان کر دے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا (گناہ کئے) اللہ کے رحم و کرم سے مایوس مت ہو، کیونکہ اللہ سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ بیشک وہی بڑا بخشنے والا مہربان ہے"۔

اس بنا پر ابلیس کہتا ہے کہ رحمتِ باری سے میری ناامیدی اور مایوسی ہی سے سوز دروںِ کائنات ہے، رونقِ ہستی ہے، اور رزمِ خیر و شر کا بازار گرم ہے۔ پھر میرے حق میں تَقْنَطُوْا اچھا ہوا یا لَا تَقْنَطُوْا؟

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار

یہ شعر قلم پنجاب کے پیرزادوں سے کے تحت واقع ہوا ہے۔ شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ ممتاز الاولیاء اللہ میں سے تھے۔ جنہیں مجدد الف ثانی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے بعض دشمنانِ حق نے مغل بادشاہ جہانگیر تک یہ جھوٹی خبر پہنچائی کہ شیخ احمد روز بروز حضور کی رعایا میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہا ہے۔ عقیدت مندوں کی تعداد میں برق رفتاری سے اضافہ کر رہا ہے اور مقصد یہ ہے کہ حضور کے تخت و تاج پر متمکن ہو۔ خصوصاً احکام شرعی سے بے نیاز بادشاہ اور بھی زیادہ خائف بداعتماد اور وہمی طبیعت کے ہوتے ہیں چنانچہ جہانگیر نے آپ کے زہد و تقویٰ، ذکر و عبادت اور مسلک درویشی پر قطعاً یقین نہ کرتے ہوئے آپ کو دربار میں باز پرس کے لئے بلا بھیجا، جب آپ دربار میں پہنچے، تو اُن مشرکانہ اور بدعتی آداب و رسومات کی بجا آوری سے کُلّی پرہیز کیا جو اکبر کے عہد سے دربارِ مغلیہ میں رائج چلے آتے تھے یعنی کم از کم یہ بھی گوارا نہ کیا کہ بادشاہ کو قدرے جُھک کر کورنش بجا لائیں۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا ہے:-

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے

موحّد بزرگوں کو دُنیا کے ہر فرد میں مخلوق کے سامنے گردن جھکانے سے اس بنا پر نفرت رہی ہے کہ ادب و احترام کا یہ فعل سراسر معبود برحق اور خدائے واحد کا حق ہے۔ اور کیا خوب فرمایا ہے:۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

پس شیخ احمد کے گردن نہ جھکانے کو جہانگیر نے بغاوت پر محمول کیا اور اس کا شک و شبہ اور بھی بڑھ گیا۔ اس "بغاوت" کے جرم میں آپ کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا بعد ازاں جہانگیر کو خواب میں تنبیہ اور زجر و توبیخ ہوئی۔ اس نے آپ کے روحانی مقام کو سمجھا عزت و احترام کے ساتھ فوراً آپ کو رہا کیا، اور معافی مانگتے ہوئے دعا کی درخواست کی۔

محرم اسرار اس زمانے کے لئے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن!

تم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن صلا۲۱۴

"قُم باذن اللہ" یعنی "اللہ کے حکم سے اُٹھ کھڑا ہو" یہ الفاظ قرآن حکیم میں سے ہیں، جو حضرت عیسٰےؑ کے معجزۂ احیائے موتیٰ کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ حضرت عیسٰےؑ کو جہاں یہ معجزات عطا کئے گئے کہ وہ مادر زاد اندھوں کو بینا کر دیتے تھے، کوڑھیوں اور برص کے مریضوں کو تندرست کرتے تھے، اور آسیب زدہ لوگوں کو حالتِ اعتدال پر لاتے تھے وہاں انہیں یہ عدیم النظیر معجزہ بھی تفویض کیا گیا کہ وہ حکمِ "قُم" (اٹھ کھڑا ہو) سے قطعی طور پہ مردہ انسانوں کو دوبارہ زندہ کر دیتے تھے۔ بعض لوگوں نے مردوں کو زندہ کرنے کی تاویل یہ کی ہے کہ حضرت عیسٰےؑ روحانی اور اخلاقی طور پر مُردہ لوگوں کو "قُم باذن اللہ" کہہ کر ایک نئی روحانی زندگی عطا فرماتے تھے۔ یہ تاویل الفاظِ قرآنی اور روایت و درایت ہر دو لحاظ سے لغو و لایعنی ہے۔ ایک عظیم الشان معجزے کی تذلیل ہے، اور حضرت عیسٰےؑ کے مقامِ نبوت کی صریح توہین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ یقیناً جسمانی طور پر مُردہ دیے کار انسانوں میں روح کو از سرِ نو حلول کر کے انہیں حیاتِ تازہ عنایت فرماتے تھے، اور "روح اللہ" ہونے کی حیثیت سے بھی محیر العقل اور فوق العادت چیز اُن کے شایانِ شان بھی ہے۔ علاوہ ازیں عقلِ سلیم بھی بآسانی تسلیم کرتی ہے کہ جس ہستیِ مقدس کے جسم میں اللہ تعالیٰ کی روح کارفرما ہو، اُس کے نزدیک حکمِ "قُم" سے مُردوں کو زندہ کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہاں قرآن حکیم سے یہ ضرور ثابت ہے کہ وہ ہر مُردے کو باذنِ الٰہی (یعنی حکمِ خداوندی) دوبارہ زندہ کرتے تھے۔ بالفاظِ دیگر مخلوق ہونے کی حیثیت سے انہیں ذاتی طور پر یہ اختیار حاصل نہیں تھا، کہ مُردہ انسانوں کو از سرِ نو

زندگی عطا کریں۔ مارنا یا زندہ کرنا سراسر خالقِ کائنات کا حق ہے۔ چنانچہ حکم یقیناً خالق کا تھا، مگر وہ اُس حکم کو نافذ العمل اور ظہور پذیر کرنے کا ایک مقدّس ذریعہ بنا دیئے گئے تھے باذن اللہ" (بحکمِ الٰہی) کی ترکیب اِس صداقت پر ایک بیّن شہادت ہے۔ بنا بریں یہی عقیدہ ایک صحیح مستند اور اسلامی عقیدہ ہے، جس سے قرآن کے اصولِ توحید میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ تمام تاویلیں اور خیالات و قیاسات شرک سے معمور ہیں، اور فہم و شعور کی لغزش کا نتیجہ ہیں!

بہرکیف مندرجہ بالا قطعہ سے علامہ اقبالؔ کا مقصد یہ ہے کہ صحیح معنوں میں انقلاب انگیز روحانی قوتوں کے مالک اِنسان اس وقت عالمِ اسلام میں نابود ہیں۔ محض مسندوں کو سنبھالنے اور قبور کی آمدنی بٹورنے والے مجاور باقی رہ گئے ہیں۔ جنہیں نفسانی خواہشات کی پرستش ہی سے نجات نہیں :-

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

ضربِ کلیمؑ

"ضربِ کلیم" کے اشارات

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر صلا

بنی اسرائیل کے لئے جب فرعون اور آلِ فرعون کے مظالم ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو اُنہوں نے اپنے امام و پیشوا حضرت موسیٰؑ سے درخواست کی کہ وہ انہیں مصر سے نکال کر ارضِ موعود (شام) ہمیں لے چلیں۔ چنانچہ راستے میں ایک ایسا لق و دق بیابان آیا کہ میلوں تک پانی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ پیاس کی شدت سے اُن کی زبانیں ہونٹوں سے باہر لٹکنے لگیں اور اُنہوں نے حضرتِ موسیٰؑ سے درخواست کی کہ وہ خدائے کریم سے پانی طلب کریں۔ اُنہوں نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ آسمان سے جواب آیا کہ پتھر پہ عصا سے ضرب لگا، پانی جاری ہو جائے گا۔ قرآنِ حکیم میں مکمل آیۂ شریفہ یوں ہے:۔

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ (پ ۱ : ع ۷)

ترجمہ:۔ "اور یاد کرو جبکہ موسےؑ نے اپنی قوم کے لئے (ہم سے) پانی مانگا۔ ہم نے کہا اپنی لاٹھی پتھر پر مار۔ پس لاٹھی مارتے ہی اُس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر ایک خاندان نے اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ (ہم نے کہا) اللہ کی دی ہوئی روزی کھاؤ اور پیو، مگر اللہ کی زمین میں جگہ جگہ فساد مت کرتے پھرو۔"

"سنگِ راہ" سے چشمہ پھوٹنے کا اشارہ اسی واقعہ کی جانب ہے!

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ! ص ۴

اس شعر میں اشارہ ہے اُس واقعہ کی طرف جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے آذر کا صنم کدہ اپنے جذبۂ توحید کے ماتحت پاش پاش کر دیا تھا۔ علامہ مرحوم فرماتے ہیں کہ موجودہ دنیا بھی شرک، بت پرستی اور غلامیِ ہوا و ہوس کی بنا پر صنم کدہ بن رہی ہے، لہٰذا عہدِ حاضر کو مبہم طور پر ایسے ابراہیم کی تلاش ہے جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی برکت و قوت سے تمام صنم کدوں کو پاش پاش کر دے۔ اور توحیدِ خداوندی کی بنائیں پھر سے استوار کرے!

تو معنیِ والنّجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج ص۹

یہ شعر نظم "معراج" کے تحت واقع ہوا ہے۔ "النّجم" قرآن مجید کی ایک سورت کا نام ہے اللہ تعالیٰ نے شروع ہی میں ستارے کی قسم کھائی ہے، اور اس قسم کی ضمانت دے کر نبی کریمؐ کے خصوصی وہ فضائل ذکر فرمائے ہیں جو حضورؐ کو معراج کی رات حاصل ہوئے:۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۙ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ؕ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ؕ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۚ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۚ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۚ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۚ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا

ترجمہ:۔ قسم ہے مجھے ستارے کی جب وہ نیچے کو چلے (یعنی ڈوب جائے) تمہارا ساتھی (پیغمبرؐ) نہ تو (راہِ راست سے) بھٹکا ہے نہ بھٹکا ہے، اور نہ اپنے دل کی خواہش سے وہ کوئی بات کہتا ہے۔ اس کی جو بات بھی ہے وحی الٰہی ہے جو اس کی جانب بھیجی جاتی ہے اس کو بڑے زور والے (فرشتے جبریل) نے وہ وحی پہنچائی اور سکھائی ہے۔ بڑے خوبصورت نے جو کہ پھر اوپر (بجانبِ عرش) چڑھ گیا، آسمان کے اونچے کنارے ہیں۔ پھر وہ اُترا اور (پیغمبرؐ کے پاس) آ گیا، اتنا پاس کہ دو کمان کا یا اس سے

بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ پھر اُس کو اللہ تعالیٰ کے بندے (حضرت محمدؐ) کو جو بتلانا تھا وہ بتلایا۔ پیغمبرؐ نے جو دیکھا تھا اُس میں اپنے دل سے جھوٹ نہیں ملایا۔ پیغمبرؐ نے جو کچھ دیکھا، کیا اُس کی صداقت کے متعلق اُس سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ پیغمبرؐ تو اُس کو ایک مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکا ہے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، جس کے قریب ہی بہشت ہے جو (نیک بندوں کا) ٹھکانا ہے۔ جب اُس سدرۃ المنتہیٰ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا (یعنی تجلّیاتِ باری تعالیٰ) تو پیغمبرؐ کی نگاہ جھپکی نہیں۔ اور نہ حد سے بڑھی بے شک ہمارے پیغمبرؐ نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔"

یَغْشٰی ﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ﴿
(پ ۲۷ : ع ۴)

پھر کیفیت "والنجم" میں حسبِ تصریح تفاسیر اُس ستارے کی قسم کھائی گئی ہے جو بوقتِ بعثتِ نبویؐ روئے زمین پر ضوفگن ہوا۔ اور کمال یہ ہے کہ آنحضرتؐ معراج میں اِس ستارے کو تو کیا جملہ اجرامِ سماوی کو روندتے ہوئے عرشِ بریں تک جا پہنچے۔ یہ حضورؐ کے علوِ مرتبت کا

عدیم النظیر ثبوت ہے۔ اس لحاظ سے شعر کی حکمت یہ ہے کہ مومن کی روحانی پرواز کے سامنے پروین و ثریا بھی پست ہو کر رہ جاتے ہیں:۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے (اقبال)

شعر کے مصرع دوم میں فرمایا کہ تیرا مدّ و جزر (اتار چڑھاؤ) ابھی چاند کا محتاج ہے۔ یعنی تیرا جذبۂ ایمان اور شوقِ تلاطم پیدا کرنے کے لئے کسی بزرگِ کامل کی توجہ اور نگاہِ عارفانہ درکار ہے، جو تجھے اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ سائنس کے اس مسئلہ پر میں قبل ازیں بحث کر چکا ہوں کہ سمندر کے پانی میں مدوجزر (طوفان خیز ہیجان)، چاند کی کرنوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں راقم الحروف کا ایک شعر ہے:۔

نہ ہوتے حسن کے جلوے، نہ ہوتی عشق کی شورش
تلاطم ہے سمندر میں فروغِ ماہ کامل سے!

یہ سب ہیں ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام۔
وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلَّمَ الْاَسْمَا

مصرع دوم میں اشارہ ہے اس آیۂ شریفہ کی جانب:۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (پ: ۳۱) "اور ہم نے آدم کو کائنات کی تمام اشیاء کے

نام سکھا دیئے"

چونکہ مذکورہ شعر نظم "ذکر و فکر" کے تحت واقع ہوا ہے۔ لہٰذا سالک کی جستجو کے ہر دو مقام سے مراد ہے ذکرِ الٰہی اور فکرِ کائنات یعنی تدبر فی الکائنات جس سے توحید و معرفت کو فروغ حاصل ہوتا ہے، اور اس طرح سالک بآسانی اپنی منزل وصالِ حق تک پہنچ جاتا ہے۔

مقامِ ذکر، کمالاتِ رومی و عطار
مقامِ فکر مقالاتِ بوعلی سینا ص۱۶

رومی اور عطار ہر دو بزرگ اولیاء اللہ میں سے ہیں، اور انہوں نے اپنے فلسفے کی بنا سراسر اس نورِ باطن اور سوزِ عشق پر رکھی ہے، جو قوتِ ایمانی کا ثمرہ ہے۔ اس بنا پر یہ ہر دو حکماء اشراقیین کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے بوعلی سینا نے اپنے مقالات اور مباحث کی بنا محض عقلی دلائل اور فکری رجحانات پر رکھی ہے اور ان میں بہ نسبت ایمان و عشق کے منطق اور عقلی استدلال کا عنصر غالب ہے۔ بنا بریں اقبال کے الفاظ میں وہ "بندۂ خرد" ہونے کی وجہ سے حکماء کے زمرۂ مشائین سے تعلق رکھتا ہے۔ فکر اور ذکر کے معنوی فرق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہی مضمون اقبال نے فارسی نظم میں بھی بالفاظ ذیل بیان کیا ہے:۔

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم دستِ رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فروتر رفت تا گوہر رسید آں بگردابے چو خس منزل گرفت

حق اگر سوزے نداد حکمت است

شعر میگردد چو سوز از دل گرفت

میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے

قُلْ ھُوَ اللہُ کی شمشیر سے خالی ہے نیام ص۱۸۱

مصرعِ دوم میں اشارہ ہے قرآن حکیم کی اس چھوٹی مگر جامع ترین سورت کی جانب :-

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ۙ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۔ (پ۳۰)

ترجمہ :- "اے پیغمبرؐ! ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اللہ تعالےٰ ایک ہے، غنی اور بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اس کو کسی نے جنا، اس کے برابر والا (جوڑ کا) اور کوئی نہیں ہے۔"

یہ سورت مختصر ہونے کے باوجود جانِ توحید ہے۔ علّامہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ عہدِ حاضر کے مجاہدین اسلام کے پاس بظاہر گو تلوار موجود ہے، لیکن توحید کی تلوار سے اُن کا نیام خالی دکھائی دیتا ہے یعنی قرآن حکیم کے مفہوم توحید کو نہ تو انہوں نے خود براہِ راست ضبط کیا اور نہ کسی موحّدِ صادق اور عالمِ باعمل سے سمجھنے کی کوشش کی۔ حاصل کلام یہ کہ شمشیرِ توحید کی عدم موجودگی میں ہر مادی شمشیر بھی بے کار ثابت ہوتی ہے :-

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

"ذوقِ یقیں" سے مراد عقیدۂ توحید ہے!

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
۲۴۔ ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم

"قلبِ سلیم" میں اشارہ پایا جاتا ہے قرآن مجید کے اُن الفاظ کی جانب جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "ابراہیم ہمارے پاس قلبِ سلیم لے کر آیا"۔ قلبِ سلیم وہ دل ہے جو شرک، حبِ خلق اور خوفِ غیر اللہ سے قطعی طور پر آزاد ہو۔ پس حاصلِ شعر یہ ہے کہ اگر مردِ مومن کے سینے میں قلبِ سلیم ہو تو وہ ساز و سامانِ جنگ کے بغیر بھی فرزندانِ باطل کو شکست دے سکتا ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی — اقبال

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
۲۶۔ دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

یہ شعر نظم "تصوف" کے تحت واقع ہوا ہے۔ "لا الٰہ" سے اشارہ مقصود ہے مکمل کلمہ تشہد کی جانب "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" "کوئی معبود نہیں مگر اللہ، اور محمد خدا کا سچا رسول ہے"۔ فرماتے ہیں کہ عقل نے بظاہر کلمہ پڑھ کر توحید و رسالت کا اقرار

بھی کر لیا تو کیا فائدہ۔ جب تک خدا کی وحدانیت اور رسولِ برحق کا عشق تیرے لیشے لیشے میں سرایت نہ کر جائے اور اعمال اُس عشق کا ثبوت پیش نہ کریں، تب تک توحید کا زبانی دعوے بالکل بے معنی ہے!

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن! ۱۳۱ ۵

یہ شعر نظم "مومن" میں سے ہے۔ اور اس میں سراسر مندرجہ ذیل آیۂ شریفہ کا مفہوم پیش کیا گیا ہے:-

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (پ ۲۶ : ۱۱ ع)

ترجمہ:- "محمدؐ خدا کا سچا رسول ہے، اور جو لوگ اُس کے ساتھ ہیں (اصحابؓ) وہ کفار کے ساتھ تو ضرور تشدد سے پیش آتے ہیں لیکن آپس میں رحیم و کریم ہیں۔"

یاد رہے کہ مومن اپنی ذات کے لئے نہ تو کسی پر غضب ناک ہوتا ہے، اور نہ کسی پہ شفیق و رحیم، جب وہ کسی سے ناراض ہوتا ہے اور اُس پر تشدد کرتا ہے تو محض اس لئے کہ وہ مشرک، فاسق و فاجر اور احکامِ الٰہی سے باغی ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی سے محبت، شفقت اور ہمدردی کا برتاؤ کرتا ہے تو فقط اس لئے کہ وہ موحد ہے، راستباز ہے اور احکامِ الٰہی کا پابند ہے۔ گویا وہ عملی مرقع ہے اس ارشادِ نبوی کا کہ:-

اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ۔ یعنی "مومن کی محبت بھی رضائے الٰہی کے لئے ہے، اور اس کا بغض بھی رضائے الٰہی کے لئے ہے"۔

ان شواہد کی روشنی میں اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی رو سے مومن کے تشدّد اور رحم کی وجوہات تسلی بخش طور پر عیاں ہیں، اور یہ بھی واضح ہے کہ مومن حسب موقع و محل "ریشم" اور "فولاد" بنتے ہیں بالکل حق بجانب ہے :-

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

وہ نبوّت ہے مسلماں کیلئے برگِ حشیش
جس نبوّت میں نہیں قوّت و شوکت کا پیام ص۵۳

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز ص۵۱

فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے ص۴۶

مندرجہ بالا ہر سہ اشعار میں نہایت واضح اور منصفانہ طریق پر ہر اُس جھوٹی نبوّت و امامت کی دھجیاں اُڑائی گئی ہیں جو خاتم النّبیین، رحمۃ اللعالمین محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد ظہور میں آئی اور جس کا مقصد عموماً حصولِ جاہ و حشمت یا شہرت و اقتدار رہا ہے۔ پہلے شعر میں علامہ مرحوم فرماتے ہیں کہ ہر وہ نبوّت جس میں قوم کی اجتماعی زندگی کے لئے قوت و شوکت، غلبہ و اقتدار اور حصولِ آزادی کا سامان نہیں، محض برگِ حشیش (بھنگ) ہے: جو نشہ طاری کرکے جذبات و احساسات انسانی کو معطّل کر دے۔ پھر دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ نبی چونکہ کفّار کا غلام و محکوم ہو ہی نہیں سکتا، لہٰذا جہاں بھی تم محکوم نبی کو دعوائے الہام کرتے ہوئے پاؤ، اُسے کذّاب سمجھو اور اُس سے سانپ کی مانند گریز کرو، کیونکہ وہ عوام النّاس کو الہام کا فریب دے کر مجبوری و محکومی کا فلسفہ پیش کرے گا، حصولِ حرّیت کو حرام قرار دے گا، جہاد کو تاویلات سے منسوخ ثابت کرے گا، اور اس طرح اُس کی غارت گری چنگیز و ہلاکو کی غارت گری سے زیادہ تباہ کُن ثابت ہوگی، کیونکہ چنگیز نے فقط جسمانی قتل و قتال کیا تھا، لیکن یہ (محکوم نبی) قوم کی روحانی، اخلاقی، اور مذہبی زندگی کو بھی فنا کرتا ہے۔ اور پھر تیسرے شعر میں گویا تمام بحث کا حاصل بیان فرمایا ہے کہ ہر اُس شخص کی امامت و قیادت ملّتِ اسلامیہ کے لئے فتنہ و فساد اور باعثِ ذلّت و لعنت ہے، جو مسلمان کو قوّتِ فرمانروا کے سامنے جھکنے کی تلقین کرے، اور سلاطینِ وقت کا (خواہ وہ کافر و فاسق ہی کیوں نہ ہوں) مطیع و منقاد بننا چاہے؛

ان تاثرات کے بعد ناظرین بذاتِ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ خدا کے سب سے آخری، سب سے پرتر اور "صادق و امین" نبیؐ کے بعد رُوئے زمین کے کس کس خطے میں کون کون سے جھوٹے نبی ظہور پذیر ہوئے اور یہ کہ نتیجہ کار اُن کے کذب و افترا کا کیا حشر ہوا۔ المختصر جس نبی الرحمت پہ خود اللہ تعالیٰ بمع تمام برگزیدہ فرشتے اور رُوئے زمین کے مومنین شب و روز درود شریف پڑھتے ہیں، اُس نبیؐ کی توہین قدرت نے کبھی برداشت نہیں کی، اور مصنوعی پیغمبروں کو اُن کی اُمت سمیت وہ ذلت و ناکامی نصیب ہوتی رہی، جو انسانیت کیلئے ہمیشہ مرقعِ عبرت بنی رہے گی۔

مجذوبِ فرنگی نے بانداز فرنگی
مہدی کے تخیّل سے کیا زندہ وطن کو ص ۵۷

"مجذوبِ فرنگی" سے مراد ہے جرمن فلسفی فریڈرک نٹشے اور مہدی سے مراد ہے فوق الانسان (Super man) جس کا تصوّر پیش کرکے اُس نے اپنی قوم کے افراد میں تسخیر و کامیابی کی ایک نئی روح پھونک دی۔ نٹشے نے فوق الانسان کی بہت سی فوق العادت صفات و خصوصیات پیش کرتے ہوئے اپنے خطبات میں قوم کو متعدد جگہ یہ بشارت دی ہے کہ ایسا انسان مستقبل قریب میں پیدا ہوگا۔ اس کی قوتیں ناقابلِ تسخیر ہوں گی اور وہ جس طرف بھی قدم اٹھائے گا، فتح و کامرانی اُس کے پاؤں چومے گی۔ چنانچہ وہ اپنی ضخیم تصنیف "بقولِ زردشت" میں لکھتا ہے:۔

"بھائیو! مَیں فوق الانسان کا معلّم ہوں، حقیقی انسان کا مقام عام آدمیوں سے کہیں بلند ہے۔ مَیں تم سے پوچھتا ہوں کہ آدمی کی رسمی صفات اور مروّجہ ذہنیت کو ہیچ ثابت کرنے کے لئے تم نے کون سی جدّوجہد کی ہے؟ — صرف فوق الانسان ہی انسانی صفات کو عام سطح سے بلند و ممتاز کرتا ہے۔ فوق الانسان اِس زمین کی روحِ رواں ہے، تخلیقِ کائنات کا اصل مقصد ہے، نظامِ الوہی کا مرکز و محور ہے، اور بانیِ انقلاب! تمہیں اس پر پورا پورا یقین ہونا چاہیئے"!

کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے، قُم باذن اللہ ۱۴

مصرعِ اوّل میں منصور کے نعرۂ انا الحق کی جانب اشارہ ہے، جو اُس نے اپنی مستیِ عشق میں بپا کیا تھا۔ مصرعِ دوم میں قُم باذن اللہ (خدا کے حکم سے اُٹھ کھڑا ہو) سے اشارہ مقصود ہے حضرت عیسٰی کے احیائے موتٰی کی جانب۔ جب وہ یہ الفاظ ارشاد فرماتے تو مُردے بھی حکمِ الٰہی سے زندہ و سلامت اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

بہرکیف اس شعر میں علامہ مرحوم ترجمان کو یہ تلقین فرما رہے ہیں کہ خون کے جس جوش کے منصور کی تعلیم میں "ذاتِ حق" کے سوا ہر چیز کو باطل و موہوم قرار دیا تھا، وہی خون آج تیری رگوں میں بھی موجزن ہے، لہٰذا عشقِ الٰہی کی برکت سے روحانی اور اخلاقی زندگی میں ایک حیاتِ نو حاصل کر اور مُردہ و افسردہ احساسات سے دست بردار ہو!

یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز ص۴۱

مدین میں حضرتِ موسےٰ کی ملاقات حضرتِ شعیبؑ سے، اور پھر دس سال کے عرصہ تک بکریاں چراتے رہنے کا جو واقعہ ہے، اُس کی تفصیل صفحہ نمبر ۱۶ پر دی جا چکی ہے۔ اِس شعر سے علامہ مرحوم کا مقصدِ حقیقی یہ ہے کہ مکمل طور پر عروجِ روحانی اور قوتِ تسخیر حاصل کرنے کے لئے تین چیزیں نہایت ضروری ہیں:- (۱) ہوائے دشت، یعنی عجائباتِ قدرت اور صناعیِ فطرت کا مسلسل مشاہدہ (۲) شعیب، یعنی مرشدِ کامل اور عالم باعمل کی صحبت۔ (۳) شبانیِ شب و روز، یعنی قوم کے منتشر اور پراگندہ افراد کو اجتماعی صورت میں محفوظ اور منظم کرنے کی مشق اور ضبطِ حکومت قائم رکھنے کا عملی سلیقہ۔

پس بقولِ اقبال ایک مکمل، قابلِ اعتماد اور ہر لحاظ سے کامیاب لیڈر میں مندرجہ بالا ہر سہ خصوصیات یعنی مشاہدۂ قدرت، صحبتِ پیرِ کامل، اور مشقِ تنظیم افراد بہ حیاتِ اجتماعی کا پایا جانا نہایت ضروری ہے، ورنہ بالکل اس کے خلاف اُس کی قیادت ناکام رہے گی!

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ ص۴۲

"فروغِ مغربیاں" یعنی یورپ کی ملعون تہذیب جس نے ہزاروں "ابلیسِ خاکی" پیدا کئے ہیں، جو تصنّع، ظاہرداری، نمائش اور مکر و فریب پر مبنی ہے، اور جس کی تمام

دل فریبیوں کا ماحصل فسق و فجور، حرام کاری، حرام خوری، مے پرستی، قمار بازی اور ہجوم زنانِ بازاری ہے! تہذیبِ مغرب کی اسی چمک دمک کے متعلق ایک اور جگہ فرمایا ہے:-

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

علّامہ اقبالؔ مندرجہ بالا شعر میں عہدِ حاضر کے مُسلم نوجوان کو مخاطب فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ تہذیبِ مغرب کی گمراہ کُن تجلّیات تیری نظر کو خیرہ کیئے دیتی ہیں۔ خدا کرے کہ اس مخدوش ماحول میں تیری نظر کا محافظ وہ پیغمبر ہو، جس کی آنکھ معراج میں تجلّیاتِ خداوندی کو دیکھ کر بھی نہ تو چندھیائی، نہ کمزور و بے بس ہوئی، اور نہ جادۂ مستقیم سے منحرف ہوئی۔ "مَا زَاغَ" سے اشارہ مقصود ہے اس آیۂ شریفہ کی طرف۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔ یعنی "ہمارے نبیؐ کی آنکھ ہماری تجلّیات کو دیکھ کر نہ تو خیرہ ہوئی اور نہ حالتِ اعتدال سے متجاوز ہوئی":

حاصل یہ کہ باوجود کثرتِ تجلّیاتِ باری تعالیٰ نبی کریمؐ کی چشمِ مقدس جھپکی تک نہیں سبحان اللہ کیا مقامِ ضبط و استقلال ہے:-

موسیٰؑ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسمی!

اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو
تیری سپہ انس و جن، تو ہے امیرِ جنود ص۱۱۱

یعنی اگر مومن اپنے فضائل سے کما حقہٗ باخبر ہو، وہ فضائل جنہیں قرآنِ حکیم "خلیفۃ اللہ فی الارض" "احسنِ تقویم" "حاکمِ بحر و بر" "خلاصۂ موجودات" اور "حاملِ قرآن" جیسے جامع اشارات سے واضح کر رہا ہے، تو پھر حکمتِ الٰہیہ کے قیام میں نہ صرف تمام انسان ہی اُس کے مطیع ہوں، بلکہ جنّات بھی اُس کی پیروی کریں اور وہ (مومن) امیرِ جنود ین کر سب کی قیادت کرے!

قرآنِ حکیم کی متعدد آیات سے ثابت ہے کہ دُنیا کے ہر عہد میں جو بندگانِ حق اپنی شرافت سے حقیقی معنوں میں باخبر ہوئے اور اپنی روحانی و اخلاقی عظمت کا مکمل طور پر اندازہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ملائکہ کے لشکر بھیج کر بوقتِ مصیبت اُن کی امداد کی، انس و جن یکساں طور پر اُن کی سپاہ بن گئے اور نہایت محدود تعداد کے باوجود اُنہیں کفار کے ٹڈی دل پر "فتح مبین" حاصل ہوئی۔ جنگِ اُحد، جنگِ بدر، اور عہدِ نبوی و عہدِ خلفائے راشدین کے دیگر بہت سے معرکے اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہیں!

جو حرفِ "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار ص۱۳۸

یہ شعر نظم "اشتراکیت" میں سے ہے مصرع اول میں اشارہ کیا گیا ہے اس آیۂ قرآنی

کی جانب۔ وَیَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (پ۲: ع۱۰) یعنی "اے نبی! یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ فی سبیل اللہ کتنا کچھ خرچ کیا جاسکتا ہے۔ جواب دیجیئے کہ تمہاری اشد ضروریاتِ زندگی سے زائد جو کچھ بھی ہے۔ راہ خدا اُسے صرف کرسکتے ہو"

اس آیہ شریفہ سے سرمایہ داری اور مختلف اشیا کی ذخیرہ اندوزی صریحاً ناجائز و حرام ثابت ہورہی ہے، اور اس طرح اسلام نے مزدور اور غریب و نادار طبقہ پر ظلم کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی۔ تعلیماتِ قرآن کی رو سے سرمایہ داری اور مزدور کشی کی بیخ خصوصاً تین احکام سے ہوئی۔ (۱) جب کسی حاجتمند بھائی کو قرض دو تو وہ قرضِ حسنہ ہونا چاہیئے۔ تم پہ سود لینا ہر اعتبار سے حرام ہے۔ (۲) سونا، چاندی یا بینک نوٹوں کا ذخیرہ مت کرو، کیونکہ بہ تغیر حالات ہیں یہ چیز غصبِ حقوق اور غلبۂ حرص و آز کا نتیجہ ہے ایسی دولت مثلِ قارون تمہارے لیئے وبالِ جان ثابت ہوگی، اور روزِ قیامت سانپ بن کر تمہیں ڈسے گی۔ (۳) حکمِ زکوٰۃ تمہارے لیئے خیرات و صدقات کی محض ترغیب ہی نہیں بلکہ نماز اور روزے کی طرح ایک اٹل فرض ہے جس کی جواب دہی تمہیں کرنا ہوگی۔ مالِ زکوٰۃ حساب کرکے مکمل طور پر دو، دیانت داری سے دو، اور اُن مستحق لوگوں کو دو، جو پیشہ ور سائل نہیں، جو غیرت سے دستِ سوال دراز نہیں کرتے، اور مسئول سے اس بُری طرح چمٹ نہیں جاتے کہ خیرات لے کر ہی ٹلیں گے۔

بہرکیف معاشی اور اقتصادی طور پر اسلام کے یہ اصولِ فیض رساں اس قدر مبنی بر مساوات ہیں کہ بقولِ اقبال روس کی موجودہ اشتراکیت (جو کئی لحاظ سے خلافِ فطرت اور مبنی بر افراط

تقریظ ہے) اُن کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ "جاوید نامہ" میں بھی "ملّتِ روسیہ" کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

اے کہ می جوئی نظامِ عالمے
جستۂ او را اساسِ محکمے؟

داستانِ کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کُن از اُمّ الکتاب

با سیہ فاماں یدِ بیضا کہ داد؟
مژدۂ لا قیصر و کسریٰ کہ داد؟

در گذر از جلوہ ہائے رنگ رنگ
خویش را دریاب از ترکِ فرنگ

گر ز مکرِ غربیاں باشی خبیر
روبہی بگذار و شیری پیشہ گیر

چیست روباہی؟ تلاشِ ساز و برگ
شیرِ مولا جوید آزادی و مرگ

جز بقرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب
کارِ جان است ایں، نہ کارِ کام و لب

خیزد از وے شعلہ ہائے سینہ سوز
با مزاجِ تو نمی سازد ہنوز

اے شہیدِ شاہدِ رعنائے فکر
با تو گویم از تجلّی ہائے فکر

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!
کس نداند لذّتِ قرضِ حسن

از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دنداں و چنگ

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست | ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
بندۂ مومن امیں، حق مالک است | غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است
رایتِ حق از ملوک آمد نگوں | قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں
آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

افغان باقی، کہسار باقی
اَلحُکمُ لِلّٰہ! اَلمُلکُ لِلّٰہ! ۱۴۶

مصرعِ دوم کے پہلے ٹکڑے میں قرآنِ حکیم کے ان الفاظ کی جانب اشارہ ہے:۔
اِنِ الحُکمُ اِلَّا لِلّٰہِ (سورۂ یوسف) یعنی "اللہ کے سوا حکومت کا حق کسی اور شخص کے لئے نہیں ہے۔"
اسی طرح مصرعِ دوم کے دوسرے ٹکڑے میں اشارہ پایا جاتا ہے اس آیۂ قرآنی کی جانب:۔

وَلِلّٰہِ مُلکُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ وَمَا بَینَھُمَا (پ ۶: ع ۷) | ترجمہ: یعنی "فقط اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے حکومت آسمان و زمین کی اور اُن تمام اشیاء کی جو اُن کے درمیان ہیں۔"

اِس بنا پر وراثتِ ارضی کا حق مومن کے لئے یوں ثابت ہُوا کہ وہ روئے زمین پر صحیح معنوں میں اللہ تعالےٰ کا خلیفہ اور نائب ہے :-

"ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست"

ارمغان حجاز

"ارمغانِ حجاز" کے اشارات

یہ عناصر کا پرانا کھیل، یہ دُنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں ص ۲۱۴

"ساکنانِ عرشِ اعظم" سے مراد ہیں فرشتے، اور اُن کی تمناؤں کے خون ہونے کا واقعہ یوں ہے کہ روئے زمین پہ آدم کے دخل عمل پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اُنہوں نے اللہ تعالےٰ سے کہا "کیا تو روئے زمین پر ایسی ہستی کو متمکن کر رہا ہے جو اُس میں فساد اور خونریزی کرے گی؟ حالانکہ ہبوطِ آدم سے اگر تیرا مقصد ذکر و عبادت ہی ہے تو ہم پہلے ہی تیری حمد و ثنا اور تسبیح و تقدیس کا حق ادا کر رہے ہیں۔" اس پر اللہ تعالےٰ نے انہیں ڈانٹ پلاتے ہوئے جواب دیا کہ "تخلیقِ آدم کی حکمت و ماہیت کو فقط میں ہی خوب جانتا ہوں، اور تم میرے علم کی تہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں آدم کو اشیائے عالم کے "اسماء" کا جو بسیط علم عطا کیا گیا ہے، تم اس سے بے بہرہ ہو"! بہرحال یہ جواب سنتے ہی فرشتوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

مشیّت ایزدی اور حکمتِ الٰہی کے سامنے ساکت و صامت رہ گئے اور اپنے ضعفِ علم وشعور کا اعتراف کیا۔ پس فرشتے ہبوطِ آدم اور خلافتِ آدم فی الارض پر جو معترض ہو رہے تھے، اُس کا مُسکت جواب سُننا اور اعترافِ شکست کرنا ہی ان کی "تمنّاؤں کا خون" ہونا تھا۔

مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر ص ۲۱۷

"سلطان" یا بہ لفظِ دیگر "شہنشاہ" کے احساسات و رجحانات کی توضیح فرماتے ہوئے علامہ مرحوم کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص ایک مستبد اور حریص و نفس پرست سلطان کہلائے گا، جو اپنی خداداد جائداد پر قانع نہ رہتے ہوئے غیروں کی زمین یا املاک پر نظر رکھے اور اُسے ہر ناجائز طریقے سے گرفت میں لائے۔ اس کیرکٹر کا شخص خواہ مجلسِ ملّت یعنی دینی و قومی حلقے میں ہو، یا دربارِ پرویز (سیاسی ماحول) میں، وہ ظالم ہے، غاصب ہے، اور انسانیت کے لئے ایک مہلک وبا ہے حسبِ آیۂ قرآنی "اُس کا معبود فقط اُس کا نفسِ امّارہ ہے"۔

اِس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!

مصرعِ دوم میں اشارہ ہے اس آیۂ شریفہ کی جانب:۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاۤءُ وَاللّٰهُ — ترجمہ۔ اور فقط اللہ کے لئے ہے حکومت آسمانوں اور زمین کی، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے

عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۔ (پ: ۶ع) "وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اسی بنا پر ایک اور جگہ فرمایا ہے:۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بُتانِ آذری

"اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ" کے عنوان سے "بالِ جبریل" میں بھی یہی مفہوم و مقصد بیان کیا گیا ہے:۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نُورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خُوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

جہاں کی روح رواں لا الٰہ الا ھُو
مسیح و میخ و چلیپا، یہ ماجرا کیا ہے؟ ص ۲۴۴

فرماتے ہیں کہ جب اس جہاں کا مقصدِ تخلیق اور اس کی روحِ رواں فقط توحیدِ باری تعالٰی اور عبادتِ حق ہے، تو پھر مسیح ابنِ مریم کو تبلیغ توحید اور تلقین ایمان و تقویٰ کے جرم میں میخ و چلیپا (صلیب) سے کیوں دوچار ہونا پڑا؟

بہرکیف اصل مفہوم و مقصد یہ ہے کہ تبلیغ حق کے جرم میں انبیاء، شہداء، صالحین اور اولیاء اللہ کو طرح طرح کے مصائب سہنا پڑے ہیں، اور انھوں نے عشق الٰہی میں اف تک نہیں کی۔ قرآن مجید تو اہلِ باطل کے مظالم کو اس حد تک بیان فرماتا ہے کہ بیشتر انبیاء کو محض تبلیغ توحید کی پاداش میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ بایں ہمہ سخت سے سخت ابتلاء میں بھی وہ اولوالعزم بندگانِ حق نہ تو خائف و مایوس ہوئے اور نہ اپنے فرض کی تعمیل میں کوتاہی کی۔ ایسے اولیاء اللہ کی شانِ عزم و ہمت ذیل کی آیۂ شریفہ سے ثابت ہے:-

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (پ ۱۱ ع ۱)

ترجمہ: "یاد رکھو کہ اللہ کے سچے دوست فقط وہی لوگ ہیں جن (کے دل و دماغ) پر خوف اور غم کا کبھی غلبہ نہیں ہوتا۔"

محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست
خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات ص ۲۴۲

یعنی ایک سالک راہِ حق جب غیروں کا محکوم ہو، اور اُس کے جذبات و تصورات پر بھی سراسر محکومی و غلامی کا اقتدار ہو، تو اُس کا "ہمہ اوست" بجائے خود عقیدۂ توحید یا عشقِ حق کے یہ ہمہ اوست ہے کہ بذاتِ خود وہ مُردہ بھی ہے، قبر بھی، اور خود ہی اپنے لئے مرگِ ناگہاں بھی!

علامہ مرحوم نے اپنے فارسی کلام میں بھی متعدد جگہ فرمایا ہے کہ "آزاد کی موت فقط ایک بار واقع ہوتی ہے اور وہ ایک لمحہ کے لئے۔ بخلاف اِس کے محکوم اپنے خوف و وسواس اور مجبوری و اوہام پرستی میں موت سے پیشتر ہزار مرتبہ مرتا ہے۔"

چنانچہ اسی مفہوم و مقصد کے تحت "جاوید نامہ" کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:-

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ
یک مقام از صد مقام اوست مرگ

می فتد بر مرگ آں مردِ تمام
مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام

ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ
زندگی اورا حرام از بیمِ مرگ

بندۂ آزاد را شانے دگر
مرگ اورا می دہد جانے دگر

او خود اندیش است مرگ اندیش نیست
مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست

بگذر از مرگے کہ سازد با لحد
زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد

مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک
آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک

آں دگر مرگ انتہائے راہِ شوق
آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق